ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۲	اکتوبر ۱۹۷۴ء مطابق رمضان ۱۳۹۴ھ	عدد ۲

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

زرسالانہ بارہ روپے۔ فی پرچہ ۱/۲۵ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

مرزا غلام احمد قادیانی کے متبعین کے بارے میں پاکستان کی قومی اسمبلی نے حال ہی میں جو متفقہ فیصلہ کیا ہے اس پر لفظ "فیصلہ" کا اطلاق صحیح نہیں۔ یہ تو مسلم قوم کے عقیدہ و ایمان کا اس کے نمائندوں کی طرف سے ایوانِ حکومت کے اندر برملا اظہار ہے یا دوسرے لفظوں میں قوم کے نمائندوں کی زبان سے اس بات کا اعتراف ہے کہ ملکی دستور میں جس بنیادی حقیقت کو گذشتہ ستائیس برس سے نظر انداز کیا جا رہا تھا اُسے آئین میں شامل کر لیا گیا ہے۔ ورنہ جہاں تک اسلام میں عقیدہ ختم نبوت کی بنیادی اہمیت کا تعلق ہے وہ تو اسی روز سے مسلم ہے جس روز سے خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کی صراحت کر دی ہے۔ اس عقیدہ پر ایمان لا کر ہی کوئی شخص دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے۔ مجرد خدا پر ایمان تو مسلمانوں کے علاوہ دوسرے بیشمار لوگ اور متعدد قومیں بھی رکھتی ہیں۔ پھر دنیا میں ایسے افراد کی بھی کمی نہیں جو نہ صرف توحید کے قائل ہیں بلکہ آخرت، نبوت، حشر و نشر پر بھی اعتقاد رکھتے ہیں۔ ان کے اور مسلمانوں کے مابین اگر اختلاف ہے تو صرف یہ کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری نبی ہونے کی وجہ سے قیامت تک منشائے الٰہی کے واحد ترجمان ہیں۔ حضورؐ کی لائی ہوئی تعلیمات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہی وہ فیصلہ کن معیار ہے جس کے مطابق نوعِ بشری کو رہتی دنیا تک صحیح و غلط اور محمود و مذموم کے مابین تفریق کرنا ہوگی۔

دنیا کے بہت سے لادین افراد، بعض کے غیر مسلم ہونے میں کسی مسلمان کو ذرہ برابر بھی شبہ نہیں، حضورؐ کا متعدد وجوہ کی بنا پر احترام کرتے ہیں۔ بعض کے نزدیک حضورؐ ایک انقلابی شخصیت کے مالک تھے اور بعض کے خیال میں حضورؐ نے مصلح کی حیثیت سے شاندار کردار ادا کیا۔ بعض مفکرین کی نظر میں حضورؐ سرورِ کائنات نے تہذیب کے گیسو سنوارے

اور عقل کو چار چاند لگائے اور بعض کے نقطۂ نظر کے مطابق حضوؐر نے معیشت کو عدل و انصاف کی بنیاد پر استوار کرنے میں شاندار کارنامہ سرانجام دیا۔ حضوؐر سرور کائنات کے یہ سارے کارنامے اپنی جگہ بجا اور درست اور حضوؐر کی عظمت کے ناقابل تردید شواہد! مگر محض ان کے اعتراف سے کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا۔ مسلمان ہونے کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ زبان سے اور دل کی گہرائیوں سے اس حقیقت کا اعتراف کرے اور اس اعتراف کو اپنی زندگی کا سب سے بیش قیمت سرمایہ تصور کرے کہ خداوند تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے نبوت کا جو مقدس سلسلہ قائم کیا تھا اسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر ختم کر دیا گیا ہے۔ اب قیامت تک حضوؐر ہی انسانوں کے مطاع اور ہادی اور رہنما ہیں، اور جو شخص حضوؐر کی اطاعت، حضوؐر کی ہدایت اور حضوؐر کی رہنمائی کے مقابلے میں کسی دوسرے فرد یا گروہ کی اطاعت اور رہنمائی کو جزئی یا کلی فوقیت دیتا ہے یا اپنے اندر اس قسم کا کوئی رجحان بھی رکھتا ہے۔ وہ ایمان کی دولت سے یکسر محروم ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کے سلسلے میں بعض گمراہ طبقے بڑی عیاری کے ساتھ لوگوں کے اندر اس باطل خیال کو بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضوؐر بلا شبہ نبی برحق تھے، اُن کے عظیم الشان کارنامے بھی ہر لحاظ سے قابلِ ستائش ہیں، لیکن حضوؐر کی نبوت اور حضوؐر کی تعلیمات کا تعلق چونکہ اُس مخصوص دور سے تھا جس میں آپؐ مبعوث ہوئے اسی لیے ان کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد یا زیادہ سے زیادہ اُن کی وفات کے دس بارہ سال بعد وہ دَور ختم ہوگیا۔ لہٰذا حضوؐر کے ارشادات و فرمودات اور ان کے پاکیزہ افعال و اعمال خواہ اُس مخصوص دَور کے لیے کس قدر غیر معمولی اہمیّت کے حامل رہے ہوں مگر آج کے دَور میں وہ تمام کے تمام واجب الاتباع قرار نہیں دیئے جاسکتے ___ آج عصری تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر ان کی صحت اور افادیت کا فیصلہ کرنا ہوگا۔ ان عیار لوگوں کے الفاظ خواہ کتنے ہی دلفریب اور دلکش ہوں لیکن ان کے پیچھے صرف یہی جذبہ کام کرتا ہے کہ حضوؐر کی نبوت کو ایک عارضی اور وقتی رہنمائی سمجھ کر اُسے ایک قصّہ پارینہ بنا دیا جائے۔

بالکل اسی نوعیت کی گمراہی کا وہ لوگ شکار ہیں جو حضوؐر کی نبوت کے تو قائل ہیں مگر نبوت کے اس مقدس

سلسلے کو آپ کی ذات پر اختتام پذیر ہونے کے قائل نہیں اور اپنے اس صریح انکار، جو بالکل کفر ہے، کی ایسی بھونڈی تاویلات کرتے رہتے ہیں جس سے وہ اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النّبیین کی حیثیت سے مبعوث فرمایا تھا۔ یہ لوگ بعض دوسرے عیار غیر مسلموں کی طرح کبھی کبھی اپنی زبان سے حضوؐر کی عظمت کا اعتراف بھی کر دیتے ہیں مگر اس اعتراف کے پیچھے وہ ساری فریب کاریاں موجود ہوتی ہیں جن کا دوسرے غیر مسلم اور لادین عناصر تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی تقریروں اور تحریروں اور اخباری بیانات میں حضوؐر کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں، ان کے محاسن بھی گنواتے ہیں، اور ان حقائق کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ حضوؐر نے انسانیت پر بڑے احسانات کیے ہیں، اُن کی ذات جامع کمالات ہے اور ان میں تمام انبیاء کے اوصاف بدرجہ اتم موجود ہیں۔ کوئی دوسرا پیغمبر اپنے مرتبے اور مقام میں ان کے برابر نہیں ہو سکتا مگر وہ ان دلکش فقروں کی آڑ میں یہ کہہ کر مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کے لیے راستہ ہموار کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضوؐر کی غلامی میں اس قدر خیر و برکت پائی جاتی ہے کہ اس میں سچے دل سے گرفتار ہونے کے بعد ایک شخص نبی بن سکتا ہے۔ چنانچہ محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خاتم النّبیین کہا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ سلسلہ نبوت آپ کی ذات اقدس پر ختم ہو گیا ہے بلکہ یہ ہے کہ جس شخص پر حضوؐر کی اطاعت کی مہر تصدیق ثبت ہو جائے وہ نبوت کا حقدار ہو جاتا ہے۔

یہ ہے وہ ضلالت و گمراہی جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے اعتراف کے پردے میں بڑی عیاری سے پھیلائی جاتی ہے۔ بعض لوگ اپنی کم عقلی کی وجہ سے اس کفر کو پہچاننے سے قاصر رہتے ہیں درآنحالیکہ یہ ہے صریح کفر۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ سارے انبیاء میں افضل ہیں اور ان کی جملہ صفات حضوؐر کی ذات اقدس میں اپنے پورے کمالات کے ساتھ جمع ہیں یا بالفاظِ دیگر خدا کے بعد جس عظیم ہستی کا کوئی انسان تصور کر سکتا ہے وہ محمد رسول اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہی ہے۔ دنیا میں نیکی، پرہیز گاری، خدا خوفی، شرافت، امانت اور دیانت کی جو قندیلیں بھی روشن ہیں وہ سب حضوؐر کے نور سے مستنیر ہیں۔ یہ سب حقائق اپنی جگہ بالکل صحیح اور درست ہیں اور انہیں تسلیم کرنا ایمان کا اہم تقاضا ہے لیکن محض اسی تقاضے کو پورا کرنے سے ایمان کا وہ تقاضا پورا نہیں ہوتا جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کی بنیادی شرط قرار دیا گیا ہے۔ حضوؐر کی ذات بلاشبہ تمام انبیاء کے اوصاف کا مظہر اتم تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی اتنی ہی بنیادی

اہمیت کی حامل ہے جتنی کہ حضورؐ کی غیر معمولی عظمت کہ حضورؐ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے وہ آخری رسول ہیں جن پر سلسلہ نبوت ختم ہو گیا ہے۔ حضورؐ کی ذات اقدس اگر ایک زاویہ نگاہ سے نبوت کی معراج ہے تو دوسرے زاویہ نگاہ سے نبوت کا اختتام بھی ہے اور حضورؐ کی ان دونوں حیثیتوں کا ماننا حضورؐ پر ایمان کا لازمی اقتضا ہے۔ اگر ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل تو تسلیم کرتا ہے مگر انہیں ختم الرسل نہیں مانتا تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص حضورؐ کو آخری نبی کی حیثیت سے تو مانتا ہے مگر ان کے مقابلے میں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو افضل جانتا ہے تو اُس کا دل بھی متاعِ ایمان سے خالی ہے۔

گمراہی کے اندر کشش اور وزن پیدا کر کے اس کا پرچار کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے گمراہ کُن مفروضات قائم کیے جائیں کیونکہ ان مفروضات پر ہی کسی گمراہ کُن نظریہ کی عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ عقیدۂ ختم نبوت کے بارے میں گمراہی پھیلانے والوں نے سب سے پہلے غلط مفروضات ہی قائم کیے ہیں۔ ان میں سے پہلا غلط مفروضہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نئے نبی کی بعثت کو حضورؐ کی غلامی کی رہینِ منت سمجھ لیا گیا ہے۔ یعنی جو شخص بھی سچے دل کے ساتھ حضورؐ کی پیروی کرے گا اس کے روحانی درجات اتنے بلند ہو جائیں گے کہ اس کے سر پہ نبوت کا تاج رکھ دیا جائے گا۔ مقامِ نبوت کے بارے میں اس غلط اور گمراہ کُن نظریہ کا یہ پہلا مقدمہ ہی بالکل غلط ہے۔ نبوت کسی عظیم تر نبی کی پیروی سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت بالغہ کے تحت جسے چاہتا ہے اُسے اس خصوصی امتیاز سے سرفراز فرما دیتا ہے۔ قرآن مجید میں اس حقیقت کو بڑے واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

مَا یَوَدُّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَلَا الۡمُشۡرِکِیۡنَ اَنۡ یُّنَزَّلَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ ؕ وَاللّٰہُ یَخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ ﴿البقرہ - ۱۰۵﴾

یہ لوگ جنہوں نے دعوتِ حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ خواہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے، ہرگز یہ پسند نہیں کرتے کہ تمہارے رب کی طرف تم پر کوئی بھلائی نازل ہو، مگر اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے چُن لیتا ہے اور وہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔

قرآن مجید نے اس حقیقت کو مختلف مقامات پر نہایت واشگاف الفاظ میں بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ مقامِ نبوت کسی ریاضت سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کا سارا دارومدار اللہ کی حکمت اور اس کی مرضی پر ہے وہ جسے چاہتا ہے اُسے یہ "رحمت" عطا کر دیتا ہے۔ اس پر کسی شخص کا اپنے کسی عمل کی وجہ سے استحقاق نہیں ہوسکتا۔ اگر نبوت کا دارومدار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخلصانہ پیروی پر ہوتا تو پھر اس بلند مرتبہ و مقام کے سب سے زیادہ حقدار آپ کے جانثار صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے۔ حضورؐ کی غلامی کی وجہ سے سب سے پہلے یہ اعزاز سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حصے میں آتا۔ ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس سے سرفراز کیے جاتے پھر حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی باری آتی اور اسی طرح حضورؐ کے دوسرے رفقاء کو یہ عظمت نصیب ہوتی لیکن ان حضرات میں سے کسی ایک بزرگ کے حاشیہ خیال میں بھی کبھی یہ بات نہ آئی کہ حضورؐ کی پیروی کے صدقے میں وہ مقامِ نبوت پر فائز ہونے کے مستحق ہیں۔ ان کے نزدیک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری نبی ہونا اس قدر مسلّم اور واضح حقیقت تھی کہ وہ اس بات کا کبھی تصوّر بھی نہ کر سکتے تھے کہ کوئی شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو تسلیم کرنے کے بعد خود بھی نبوت کا دعویدار ہوسکتا ہے۔ ان کے لیے جس طرح یہ باور کرنا ناممکنات میں سے تھا کہ خدا کے علاوہ بھی کوئی معبود ہوسکتا ہے بالکل اسی طرح اُن کے لیے یہ بات بھی ناقابلِ فہم تھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی نبوت کا کوئی نیا دعویدار جنم لے سکتا ہے چنانچہ جس شخص اور گروہ نے اس معاملے میں کوئی معمولی سی جسارت بھی کی اُسے انہوں نے پوری قوت سے دبا دیا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اجرائے نبوت کا باطل نظریہ جس دوسرے غلط مفروضے پر قائم ہے اس کا پورا تانا بانا ہی دجل و فریب سے تیار کیا گیا ہے اور اس کی تیاری میں بھی وہی مکاری کارفرما نظر آتی ہے جس کی جھلک اس پورے فلسفے میں بآسانی دیکھی جاسکتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے نام پر بڑی عیاری کے ساتھ اس گمراہ کن تصوّر کو لوگوں کے دل و دماغ میں بٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ بات حضورؐ کی شان کے منافی ہے کہ حضورؐ کی ذات پر سلسلہ نبوت ختم کر دیا جائے۔ نبوت کو چونکہ قرآن مجید میں رحمت قرار دیا گیا ہے اس لیے رحمۃ للعالمین کے بعد اس رحمت کا انقطاع معاذ اللہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین ہے۔ لہٰذا حضورؐ کی ارفع و اعلیٰ شان اس بات کی متقاضی ہے کہ آپؐ

کے بعد سلسلۂ نبوت کو قائم رکھا جائے ۔ اگر حضورؐ کی بعثت سے پہلے انبیاء علیہم السلام مبعوث کیے جا سکتے تھے تو حضورؐ کے وصال کے بعد بھی اس سلسلے کا قائم رہنا ضروری ہے ۔

یہ باطل مفروضہ کئی منطقی مغالطوں سے عبارت ہے ۔ سب سے پہلے یہ دعویٰ کہ حضورؐ پر سلسلہ نبوت کا اختتام حضورؐ کی شان کے منافی ہے قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے ۔ آخر یہ کیونکر فرض کر لیا گیا ہے کہ چونکہ صفت نبوت اپنے اوج کمال اور معراج کو پہنچ چکی ہے اس لیے اس کے بعد اگر اس کا سلسلہ ختم ہو جائے تو وہ اس کی توہین اور تذلیل کے مترادف ہے ۔ یہ طرز استدلال اگر صحیح مان لیا جائے تو پھر یہ اس بلند و بالا ذات کی بھی توہین ہے کہ اس کی معرفت حاصل ہو جانے کے بعد آدمی ہر دوسرے معبود سے صرف نظر کر لے ۔ اگر کسی ہستی کی عظمت کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ وہ چھوٹے بڑے پیمانے پر اپنی نوعیت کی دیگر ہستیوں کو معرض وجود میں لانے کا ذریعہ بنتا رہے تو پھر خدا کے ساتھ دوسرے خداؤں کا ماننا بھی انسان کی ایک ناگزیر ضرورت بن جاتی ہے ۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ سے پہلے انبیاء کی مثال آفتاب اور ستاروں کی سی ہے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انسان کی رہنمائی کے لیے ستاروں کی مانند انبیاء مبعوث فرمائے تاکہ بھٹکی ہوئی انسانیت راہ یاب ہو سکے مگر ان ستاروں کا وجود اس بات کا پتہ دے رہا تھا کہ ایک ایسا آفتاب طلوع ہونے والا ہے جس کی روشنی میں دوسری سب روشنیاں ماند پڑ جائیں گی ۔ وہ آفتاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کی صورت میں اس کرہ ارض پر طلوع ہوا ۔ اس آفتاب کے نمودار ہونے سے پہلے تو ستاروں کی روشنی کی بلاشبہ اہمیت تھی ۔ بلکہ اس وقت تو قندیلیں اور دیئے بھی بڑی افادیت کے حامل تھے لیکن آفتاب کے جلوہ گر ہونے کے بعد آخر اُن کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے ۔ ان کا فائدہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو صرف ان بدنصیب لوگوں کو جو سب سے پہلے اپنے آپ کو کسی ایسے تنگ و تاریک گوشے میں مقید کر لیں جہاں اس آفتاب کی کوئی کرن نہ پہنچنے پائے کیونکہ جو مقام اس کی کرنوں سے منور ہوگا وہاں دوسری روشنی بالکل عبث اور بیکار ہوگی ۔ فروغ صبح سے پہلے اگر نور کے لطیف ریزے فضائے بسیط کو

مدہم سی روشنی مہیا کر دیں تو یہ اُن کا بڑا کارنامہ ہے لیکن جب خورشید طلوع ہو کر پورے عالم کو بقعۂ نور بنا دے تو پھر یہ لطیف ریزے بالکل غیر مؤثر ہو جاتے ہیں بلکہ ان کے وجود کا انسان ادراک بھی نہیں کر سکتا۔

پھر اس حقیقت کا ایک دوسرا پہلو بھی قابلِ غور ہے۔ طلوعِ آفتاب سے پہلے تو نور کے لطیف ریزوں کی موجودگی انسان کے اندر اُمید کی شمع فروزاں کرنے کے لیے ضروری ہے کہ رات کی تاریکی چھٹنا چاہتی ہے۔ اور آفتاب جلد ہی دنیا کو منور کرنے والا ہے لیکن جب آفتاب کی کرنیں کرہ ارض کو روشن کر دیں اور انسان کو اس بات کا بھی یقین ہو کہ دوسرا کوئی آفتاب اس کی جگہ لینے والا نہیں تو مصنوعی روشنی کے چھوٹے چھوٹے فانوسوں کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کر کے ان کے دلوں میں اُمید کی کون سی جوت جگائی جا سکتی ہے۔

یہ بات انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے اور اس کے دل میں خوب کے لیے اس وجہ سے جذبہ محبت و احترام ہوتا ہے کہ اُسے اس "خوب" سے خوب تر کا پتہ ملتا ہے اور وہ اس بات کا اندازہ کر سکتا ہے کہ اگر یہ "خوب" ان خوبیوں کا حامل ہے تو "خوب تر" میں کس طرح کی خوبیاں موجود ہوں گی اور جو اس "خوب" کی سب سے آخری، سب سے افضل، سب سے زیادہ نمایاں اور سب سے بہترین صورت ہو گی تو وہ کیا ہو گی۔ "خوب" اس وقت تک تو کسی فرد یا گروہ کے لیے محبت و عقیدت کا محور و مرکز رہ سکتا ہے جب اس کی زیادہ بہتر صورت نظروں سے اوجھل رہے لیکن جب یہ "خوب" اپنی مکمل اور مثالی صورت میں سامنے آ جائے اور انسان کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ اس سے زیادہ بہتر صورت کا تصوّر ممکن نہیں تو پھر محبت اور عقیدت کے سارے جذبات صرف اسی بہترین ذات کے گرد گھومتے ہیں اور انسان کسی دوسری طرف توجہ کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہو سکتا۔

خداوند تعالیٰ نے رحمۃ اللعالمین کو جو انبیاء کا امام اور سلسلہ نبوت کی آخری کڑی بنایا ہے تو اس کے پیچھے بہت سی حکمتیں کارفرما ہیں۔ ان میں سب سے پہلی حکمت یہ ہے کہ اب جو شخص بھی اللہ کی رحمت کا طلبگار ہے اور خدا کی رضا اور خوشنودی چاہتا ہے تو اُسے اِدھر اُدھر تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کی ضرورت نہیں بلکہ اسے خلوص کے ساتھ صرف رحمۃ اللعالمین کا دامن تھام لینا چاہیے (باقی برصفحہ ۴۶)

فصل دوم

رسالتِ محمدی پر ایمان لانے کی دعوت

(۴)

یہ الزام کہ حضورؐ اپنی بڑائی چاہتے ہیں

سورۂ صٓ میں ذکر آیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سردارانِ قریش کے سامنے اپنی دعوت پیش کی تو حاضرین نے منجملہ دوسرے اعتراضات کے یہ بھی کہا کہ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ۔ "یہ بات تو کسی اور ہی غرض سے کی جا رہی ہے"۔ یعنی دراصل یہ دعوت اس لیے دی جا رہی ہے کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تابع فرمان بن جائیں اور یہ ہم پر حکم چلائیں۔

ظاہر ہے کہ یہ محض ایک الزام تھا جس کی کوئی بنیاد بدگمانی کے سوا نہ تھی۔ اس لیے اس کا کوئی جواب دینے کے بجائے قرآن مجید میں یہ بتایا گیا ہے کہ قدیم زمانے میں بھی جو اللہ کا بندہ اصلاحِ خلق کے لیے اُٹھا اس پر یہی الزام لگایا گیا۔ مثلاً حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ سے فرعون کے درباریوں نے کہا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ۔ "اے موسیٰ، کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اُس طریقہ سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور زمین میں بڑائی تم دونوں بھائیوں کی قائم ہو جائے"؟ (یونس ۷۸)۔ یہی بات حضرت نوحؑ سے ان کی قوم کے سرداروں نے کہی تھی کہ

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ	یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔ یہ
اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ	چاہتا ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے

(المومنون ۲۴)

مخالفین حق کا ایک قدیم ترین حربہ یہ ہے کہ جو شخص بھی اصلاح کے لیے کوشش کرنے اُٹھے اُس پر فوراً یہ الزام چسپاں کر دیتے ہیں کہ کچھ نہیں، بس یہ اقتدار کا بھوکا ہے۔ یہی الزام فرعون نے حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ پر لگایا تھا کہ تم اس لیے اُٹھے ہو کہ تمہیں ملک میں بڑائی حاصل ہو جائے۔ یہی الزام حضرت عیسیٰؑ پر لگایا گیا

کہ یہ شخص یہودیوں کا بادشاہ بننا چاہتا ہے۔ اور اسی کا شبہہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سرداران قریش ظاہر کرتے تھے، چنانچہ کئی مرتبہ انھوں نے آپ سے یہ سودا کرنے کی کوشش کی کہ اگر اقتدار کے طالب ہو تو "اپوزیشن" چھوڑ کر "حزب اقتدار" میں شامل ہو جاؤ، ہم تمہیں بادشاہ بنا لیتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جو لوگ ساری عمر دنیا اور اس کے مادی فائدوں اور اس کی شان و شوکت ہی کے لیے اپنی جان کھپاتے رہتے ہیں ان کے لیے یہ تصور کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے کہ اس دنیا میں کوئی انسان خلوص، نیک نیتی اور بے غرضی کے ساتھ فلاحِ انسانیت کی خاطر بھی اپنی جان کھپا سکتا ہے۔ وہ خود چونکہ اپنا اثر و اقتدار جمانے کے لیے دلفریب نعرے اور اصلاح کے جھوٹے وعدے شب و روز استعمال کرتے رہتے ہیں، اس لیے یہ مکاری فریب کاری ان کی نگاہ میں بالکل ایک فطری چیز ہوتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اصلاح کا نام مکر و فریب کے سوا کبھی صداقت اور خلوص کے ساتھ لیا ہی نہیں جا سکتا، یہ نام جو بھی لیتا ہے ضرور وہ اُن کا اپنا ہم جنس ہی ہوگا۔ اور لطف یہ ہے کہ مصلحین کے خلاف "اقتدار کی بھوک" کا یہ الزام ہمیشہ برسراقتدار لوگ اور ان کے خوشامدی حاشیہ نشین ہی استعمال کرتے رہے ہیں۔ گویا خود اُنھیں اور ان کے آقایانِ نامدار کو جو اقتدار حاصل ہے وہ تو ان کا پیدائشی حق ہے، اس کے حاصل کرنے اور اس پر قابض رہنے میں وہ کسی الزام کے مستحق نہیں ہیں، البتہ نہایت قابلِ ملامت ہے وہ جس کے لیے یہ "غذا" پیدائشی حق نہ تھی اور اب یہ لوگ اس کے اندر اس چیز کی "بھوک" محسوس کر رہے ہیں۔

اس جگہ یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جو شخص بھی رائج الوقت نظامِ زندگی کی خرابیوں کو دُور کرنے کے لیے اُٹھے گا اور اس کے مقابلے میں اصلاحی نظریہ و نظام پیش کرے گا اس کے لیے بہرحال یہ بات ناگزیر ہوگی کہ اصلاح کی راہ میں جو طاقتیں بھی سدِ راہ ہوں انھیں ہٹانے کی کوشش کرے اور ان طاقتوں کو برسر اقتدار لائے جو اصلاحی نظریہ و نظام کو عملاً نافذ کر سکیں۔ نیز ایسے شخص کی دعوت جب بھی کامیاب ہوگی، اس کا قدرتی نتیجہ یہی ہوگا کہ وہ لوگوں کا مقتدا و پیشوا بن جائے گا اور نئے نظام میں اقتدار کی باگیں یا تو اس کے اپنے ہی ہاتھوں میں ہوں گی، یا اس کے حامیوں اور پیروؤں کے ہاتھوں پر قابض ہوں گے۔ آخر انبیا اور مصلحینِ عالم میں سے کون ہے جس کی کوششوں کا مقصد اپنی دعوت کو عملاً نافذ کرنا نہ تھا؟ اور کون ہے جس کی دعوت کی کامیابی نے فی الواقع اس کو پیشوا نہیں بنا دیا؟ پھر کیا یہ امرِ واقعی کسی پر یہ الزام چسپاں کر دینے کے لیے کافی ہے کہ وہ دراصل اقتدار کا بھوکا تھا اور اس کی اصل غرض وہی پیشوائی تھی جو اس نے حاصل کر لی؟

ظاہر ہے کہ بدطینت دشمنانِ حق کے سوا اس سوال کا جواب کوئی بھی اثبات میں نہ دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اقتدار کے بجائے خود مطلوب ہونے اور کسی مقصدِ خیر کے لیے مطلوب ہونے میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اُتنا ہی بڑا فرق جتنا ڈاکو کے خنجر اور ڈاکٹر کے نشتر میں ہے۔ اگر کوئی شخص صرف اس بنا پر ڈاکو اور ڈاکٹر کو ایک کر دے کہ دونوں بالارادہ جسم چیرتے ہیں اور نتیجہ میں مال دونوں کے ہاتھ آتا ہے، تو یہ صرف اس کے اپنے ہی دماغ یا دل کا قصور ہے۔ ورنہ دونوں کی نیت، دونوں کے طریق کار، اور دونوں کے مجموعی کردار میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ کوئی صاحب عقل آدمی ڈاکو کو ڈاکو اور ڈاکٹر کو ڈاکٹر سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔

یہی معاملہ حضرت ہود علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا۔ ان کی قوم کے سرداروں نے بھی اپنے عوام کو مخاطب کر کے کہا:

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ	یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔
يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ وَيَشْرَبُ	جو کچھ تم کھاتے ہو وہی یہ کھاتا ہے اور جو کچھ تم پیتے
مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ۔ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ	ہو وہی یہ پیتا ہے۔ اب اگر تم نے اپنے ہی جیسے
بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا	ایک بشر کی اطاعت قبول کر لی تو تم گھاٹے ہی میں
لَّخٰسِرُوْنَ (المومنون ۲۳-۳۴)	رہو گے۔

سردارانِ قوم کو جب خطرہ ہوا کہ عوام پیغمبر کی پاکیزہ شخصیت اور دل لگتی باتوں سے متاثر ہو جائیں گے اور ان کے متاثر ہو جانے کے بعد ہماری سرداری پھر کس پر چلے گی، تو انھوں نے یہ تقریریں کر کر کے عام لوگوں کو بہکانا شروع کیا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ خدا کی طرف سے پیغمبری ویغمبری کچھ نہیں ہے۔ محض اقتدار کی بھوک ہے جو اس شخص سے یہ باتیں کرا رہی ہے۔ بھائیو، ذرا غور تو کرو کہ آخر یہ شخص تم سے کس چیز میں مختلف ہے؟ ویسا ہی گوشت پوست کا آدمی ہے جیسے تم ہو۔ کوئی فرق اس میں اور تم میں نہیں ہے۔ پھر یہ کیوں بڑا بنے اور تم اس کے فرمان کی اطاعت کیوں کرو؟ ان تقریروں میں یہ بات گویا بلا نزاع تسلیم شدہ تھی کہ بشر ہونے کے باوجود ہم جو تمہارے سردار ہیں تو ہمیں تو ہونا ہی چاہیے۔ ہمارے گوشت پوست اور کھانے پینے کی نوعیت کی طرف دیکھنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ زیر بحث ہماری سرداری نہیں ہے کیونکہ وہ تو آپ سے آپ قائم اور مسلّم ہے۔ البتہ زیر بحث یہ نئی سرداری ہے جو اب قائم ہوتی نظر آ رہی ہے۔ اس طرح ان لوگوں کی بات سردارانِ قومِ نوح کی بات سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی جن کے نزدیک قابلِ الزام اگر کوئی چیز تھی تو وہ اقتدار کی وہ بھوک تھی جو کسی نئے

آنے والے کے اندر محسوس ہو یا جس کے ہونے کا شبہہ کیا جا سکے۔ رہا اُن کا اپنا پیٹ، تو وہ سمجھتے تھے کہ اقتدار بہر حال اس کی فطری خوراک ہے جس سے اگر وہ بدہضمی کی حد تک بھر جاتے تو قابلِ اعتراض نہیں۔

آپؐ پر یہ الزام کہ آپ کاہن ہیں اور شیاطین آپ پر نازل ہوتے ہیں

کفار مکہ آپؐ پر یہ الزام بھی لگاتے تھے کہ آپ کاہن ہیں، اور یہ قرآن جو آپ پیش کر رہے ہیں اسے فرشتے نہیں بلکہ شیاطین آپ پر نازل کرتے ہیں۔ اس کا ذکر قرآن میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے اور اس کا جواب دیا گیا ہے۔

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ (الطّور- ۲۹)

پس اے نبی، تم نصیحت کیے جاؤ، اپنے رب کے فضل سے نہ تم کاہن ہو اور نہ مجنون۔

"کاہن" عربی زبان میں جوتشی، غیب گو اور سیانے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ ایک مستقل پیشہ تھا۔ کاہنوں کا دعوٰی تھا، اور ان کے بارے میں ضعیف الاعتقاد لوگ بھی یہ سمجھتے تھے کہ وہ ستارہ شناس ہیں، یا ارواح اور شیاطین اور جِنوں سے ان کا خاص تعلق ہے جس کی بدولت وہ غیب کی خبریں معلوم کر سکتے ہیں۔ کوئی چیز اگر کھوئی جائے تو وہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کہاں پڑی ہے۔ کسی کے ہاں چوری ہو جائے تو وہ بتا سکتے ہیں کہ چور کون ہے۔ کوئی اپنی قسمت پوچھے تو وہ بتا سکتے ہیں کہ اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ اِنھی اغراض کے لیے لوگ اُن کے پاس جاتے تھے اور وہ کچھ نذر نیاز لے کر انھیں غیب کی باتیں بتایا کرتے تھے۔ وہ خود بھی بسا اوقات بستیوں میں آواز لگاتے پھرتے تھے تاکہ لوگ اُن کی طرف رجوع کریں۔ ان کی ایک خاص وضع قطع ہوتی تھی جس سے وہ الگ پہچانے جاتے تھے۔ ان کی زبان بھی عام بول چال سے مختلف ہوتی تھی۔ وہ مُقفّٰی اور مُسجّع فقرے خاص لہجے میں ذرا ترنّم کے ساتھ بولتے تھے اور بالعموم ایسے گول مول الفاظ استعمال کرتے تھے جن سے ہر شخص اپنے مطلب کی بات نکال لے۔ قریش کے سرداروں نے عوام کو فریب دینے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کاہن ہونے کا الزام صرف اس بنا پر لگا دیا کہ آپ اُن حقائق کی خبر دے رہے تھے جو لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ ہیں، اور آپ کا دعوٰی یہ تھا کہ خدا کی طرف سے ایک فرشتہ آ کر آپ پر وحی نازل کرتا ہے، اور خدا کا جو کلام آپ پیش فرما رہے تھے وہ بھی مُقفّٰی تھا۔ لیکن عرب میں کوئی شخص بھی ان کے اس الزام سے دھوکا نہ کھا سکتا تھا۔ اس لیے کہ کاہنوں کے پیشے اور ان کی وضع قطع اور ان کی زبان اور ان کے کاروبار سے کوئی بھی ناواقف نہ تھا۔ سب جانتے تھے کہ وہ کیا کام کرتے ہیں، کس مقصد کے لیے لوگ ان کے پاس جاتے ہیں۔ کیا باتیں وہ ان کو بتاتے ہیں، ان کے مسجّع فقرے کیسے ہوتے ہیں اور کن مضامین پر وہ مشتمل ہوتے ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے

کہ کسی کاہن کا سرے سے یہ کام ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ قوم کے رائج الوقت عقائد کے خلاف ایک عقیدہ لے کر اُٹھتا اور شب و روز اس کی تبلیغ میں اپنی جان کھپاتا اور اس کی خاطر ساری قوم کی دشمنی مول لیتا۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کہانت کا یہ الزام برائے نام بھی کوئی مناسبت نہ رکھتا تھا کہ یہ پھبتی آپ پر چسپاں ہو سکتی اور عرب کا کوئی کند ذہن سے کند ذہن آدمی بھی اس سے دھوکا کھا جاتا۔ اسی بنا پر ان کے اس الزام کی تردید میں کوئی دلیل پیش کرنے کی سرے سے کوئی ضرورت محسوس نہ کی گئی، کیونکہ یہ آپ اپنی ہی تردید تھا۔ بس یہ فرمانے پر اکتفا کیا گیا کہ اے نبی، تم ان کے الزامات کی پروا کیے بغیر بندگانِ خدا کو غفلت سے چونکانے اور حقیقت سے خبردار کرنے کا کام کیے چلے جاؤ، کیونکہ نہ تم کاہن ہو اور نہ مجنون۔

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ (التکویر۔ ۲۵-۲۶)

اور یہ کسی شیطان مردود کا قول نہیں ہے، پھر تم لوگ کدھر چلے جا رہے ہو۔

یعنی تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ کوئی شیطان آکر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کان میں یہ باتیں پھونک دیتا ہے۔ شیطان کا آخر یہ کام کب ہو سکتا ہے کہ وہ انسان کو شرک اور بت پرستی اور دہریت و الحاد سے ہٹا کر خدا پرستی اور توحید کی تعلیم دے۔ انسان کو شتر بے مہار بن کر رہنے کے بجائے خدا کے حضور ذمہ داری اور جواب دہی کا احساس دلائے۔ جاہلانہ رسموں اور ظلم اور بداخلاقی اور بدکرداری سے منع کر کے پاکیزہ زندگی، عدل و تقویٰ اور اخلاقِ فاضلہ کی طرف رہنمائی کرے۔

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ۝ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ (الشعراء۔ ۲۱۰ تا ۲۱۲)

اس کتاب کو شیاطین لے کر نہیں اترے ہیں، نہ یہ کام اُن کو سجتا ہے اور نہ وہ ایسا کر ہی سکتے ہیں۔ وہ تو اس کی سماعت سے بھی دُور رکھے گئے ہیں۔

کفارِ قریش نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جھوٹ کی جو مہم چلا رکھی تھی اس میں سب سے بڑی مشکل اُنہیں یہ پیش آرہی تھی کہ اس حیرت انگیز کلام کی کیا توجیہہ کی جائے جو قرآن کی شکل میں لوگوں کے سامنے آرہا تھا اور دلوں میں اُترتا چلا جاتا تھا۔ یہ بات تو ان کے بس میں نہ تھی کہ لوگوں تک اس کے پہنچنے کو روک سکیں۔ اب پریشان کن مسئلہ ان کے لیے یہ تھا کہ لوگوں کو اس سے بدگمان کرنے اور اس کی تاثیر سے بچانے کے لیے کیا بات بنائیں۔ اس گھبراہٹ میں جو الزامات انہوں نے عوام میں پھیلائے تھے ان میں سے ایک یہ تھا

کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ کاہن ہیں اور عام کاہنوں کی طرح ان پر بھی یہ کلام شیاطین القا کرتے ہیں۔ اِس الزام کو وہ اپنا سب سے زیادہ کارگر ہتھیار سمجھتے تھے۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ کسی کے پاس یہ جانچنے کے لیے آخر کیا ذریعہ ہوسکتا ہے کہ یہ کلام کوئی فرشتہ لاتا ہے یا شیطان؟ اور شیطانی القا کی کوئی تردید کرے گا تو آخر کیسے؟

اللہ تعالیٰ نے اس پر فرمایا کہ یہ کلام اور یہ مضامین شیاطین کے منہ پر پھبتے ہی نہیں۔ کوئی عقل رکھتا ہو تو خود سمجھ سکتا ہے کہ کہیں یہ باتیں جو قرآن میں کہی جارہی ہیں شیاطین کی طرف سے بھی ہوسکتی ہیں؟ کیا تمھاری بستیوں میں کاہن موجود نہیں ہیں اور شیاطین سے ربط ضبط رکھ کر جو باتیں وہ کرتے ہیں تم نے کبھی نہیں سنیں؟ کیا تم نے کبھی سنا ہے کہ کسی شیطان نے کسی کاہن کے ذریعے سے لوگوں کو خدا پرستی اور خدا ترسی کی تعلیم دی ہو؟ شرک و بُت پرستی سے روکا ہو؟ آخرت کی بازپرس کا خوف دلایا ہو؟ ظلم اور بدکاری اور بداخلاقیوں سے منع کیا ہو؟ نیکوکاری اور راستبازی اور خلقِ خدا کے ساتھ احسان کی تلقین کی ہو؟ شیاطین کا یہ مزاج کہاں ہے؟ اُن کا مزاج تو یہ ہے کہ لوگوں میں فساد ڈلوائیں اور انھیں بُرائیوں کی طرف رغبت دلائیں۔ ان سے تعلق رکھنے والے کاہنوں کے پاس تو لوگ یہ پوچھنے جاتے ہیں کہ عاشق کو معشوق ملے گا یا نہیں؟ جوئے میں کون سا داؤں مفید رہے گا؟ دشمن کو نیچا دکھانے کے لیے کیا چال چلی جائے؟ اور فلاں شخص کا اُونٹ کس نے چرایا ہے؟ یہ معاملات چھوڑ کر کاہنوں اور ان کے سرپرست شیاطین کو خلقِ خدا کی اصلاح، بھلائیوں کی تعلیم اور بُرائیوں کے استیصال کی فکر کب سے لاحق ہوگئی؟ شیاطین اگر چاہیں بھی تو یہ کام ان کے بس کا نہیں ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے آپ کو انسانوں کے سچے معلم اور حقیقی مزکّی کے مقام پر رکھ کر خالص حق اور خالص خیر کی وہ تعلیم دے سکیں جو قرآن دے رہا ہے۔ وہ دھوکا دینے کی خاطر بھی یہ روپ دھار لیں تو ان کا کام ایسی آمیزشوں سے خالی نہیں ہوسکتا جو ان کی جہالت اور ان کے اندر چھپی ہوئی شیطانی فطرت کی غمازی نہ کردیں۔ نیت کی خرابی، ارادوں کی ناپاکی، مقاصد کی خباثت اور اخلاق کی گندگی اُس شخص کی زندگی میں بھی اور اس کی تعلیم میں بھی جھلک کر رہے گی جو شیاطین سے الہام حاصل کرکے پیشوا بن بیٹھا ہو۔ بے آمیز راستی اور خالص نیکی نہ شیاطین القا کرسکتے ہیں اور نہ ان سے ربط ضبط رکھنے والے اس کے حامل ہوسکتے ہیں۔

پھر فرمایا کہ شیاطین کا قرآن کے القا میں دخیل ہونا تو درکنار، جس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح الامین اِس کو لے کر چلتا ہے اور جس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر وہ اس کو نازل کرتا ہے، اس پورے سلسلے میں کسی جگہ بھی شیاطین کو کان لگا کر سننے تک کا موقع نہیں ملتا۔ وہ آس پاس کہیں پھٹکنے

بھی نہیں پاتے کہ سن گن لے کر ہی کوئی بات اُچک لے جائیں اور جا کر اپنے دوستوں کو پہلے سے یہ بتا دیں کہ آج محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ پیغام سنانے والے ہیں، یا ان کی تقریر میں فلاں بات کا بھی ذکر آنے والا ہے۔

یہ الزام کہ آپؐ کو کچھ دوسرے لوگ سکھاتے پڑھاتے ہیں۔

کفارِ قریش ایک طرف تو یہ کہتے تھے کہ معاذ اللہ شیاطین آپؐ پر قرآن کا القاء کرتے ہیں، اور دوسری طرف اِس کے بالکل برعکس وہ یہ الزام بھی لگاتے تھے کہ آپ کچھ دوسرے لوگوں سے سیکھ پڑھ کر یہ قرآن پیش کرتے ہیں۔

ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ (الدخان - ۱۴) پھر انہوں نے رسول کی طرف سے منہ پھیر لیا اور کہنے لگے "یہ تو سکھایا پڑھایا ہوا مجنون ہے"۔

ان کا مطلب یہ تھا کہ یہ بےچارا تو سیدھا سادھا آدمی تھا، کچھ دوسرے لوگوں نے اِسے بھرّوں پر چڑھا لیا۔ وہ در پردہ قرآن کی آیتیں گھڑ گھڑ کر اِسے پڑھا دیتے ہیں، یہ آکر عام لوگوں کے سامنے اُنہیں پیش کر دیتا ہے۔ وہ مزے سے بیٹھے رہتے ہیں، اور یہ گالیاں اور پتھر کھاتا پھرتا ہے۔ اس طرح ایک چلتا ہوا فقرہ کہہ کر وہ اُن ساری دلیلوں اور نصیحتوں اور سنجیدہ تعلیمات کو اُڑا دیتے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برسوں سے ان کے سامنے پیش کر کر کے تھکے جا رہے تھے۔ وہ نہ اُن معقول باتوں پر کوئی توجہ کرتے تھے جو قرآن مجید میں بیان کی جا رہی تھیں۔ نہ یہ دیکھتے تھے کہ جو شخص یہ باتیں پیش کر رہا ہے وہ کس پائے کا آدمی ہے اور نہ یہ الزام رکھتے وقت ہی وہ کچھ سوچنے کی زحمت گوارا کرتے تھے کہ ہم یہ کیا بکواس کر رہے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اگر کوئی دوسرا شخص در پردہ بیٹھ کر سکھانے پڑھانے والا ہوتا تو وہ حضرت خدیجہؓ اور ابوبکرؓ اور علیؓ اور زیدؓ بن حارثہ اور بیسیوں دوسرے ابتدائی مسلمانوں سے آخر کیسے چھپ جاتا جن سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب اور ہر وقت کا ساتھی کوئی نہ تھا؟ پھر کیا وجہ ہے کہ یہی لوگ سب سے بڑھ کر حضورؐ کے گرویدہ اور عقیدت مند تھے؟ حالانکہ در پردہ کسی دوسرے شخص کے سکھاتے پڑھانے سے نبوت کا کاروبار چلایا گیا ہوتا تو یہی لوگ آپ کی مخالفت میں سب سے پیش پیش ہوتے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ۚ لِسَانُ الَّذِىْ ہمیں معلوم ہے یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص کو ایک آدمی سکھاتا پڑھاتا ہے۔ حالانکہ ان

يُلۡحِدُونَ إِلَيۡهِ أَعۡجَمِيّٞ وَهَٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيّٞ مُّبِينٌ ۔ | کا اشارہ جس آدمی کی طرف ہے اس کی زبان عجمی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے۔

(النحل - ۱۰۳)

روایات میں مختلف اشخاص کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ کفارِ مکہ اُن میں سے کسی پر یہ گمان کرتے تھے۔ ایک روایت میں اس کا نام جبرٌ بیان کیا گیا ہے جو عامر بن الحضرمی کا ایک رومی غلام تھا۔ دوسری روایت میں حویطب بن عبد العزّٰی کے ایک غلام کا نام لیا گیا ہے جسے عائش یا یعیش کہتے تھے۔ ایک اور روایت میں یسار کا نام لیا گیا ہے جس کی کنیت ابوفکیہہ تھی اور جو مکے کی ایک عورت کا یہودی غلام تھا۔ ایک اور روایت بلعان یا بلعام نامی ایک رومی غلام سے متعلق ہے۔ بہر حال ان میں سے جو بھی ہو، کفار مکہ نے محض یہ دیکھ کر کہ ایک شخص توراۃ اور انجیل پڑھتا ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سے ملاقات ہے، بے تکلف یہ الزام گھڑ دیا کہ اس قرآن کو دراصل وہ تصنیف کر رہا ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اسے اپنی طرف سے خدا کا نام لے کر پیش کر رہے ہیں۔ اس سے نہ صرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین آپ کے خلاف افترا پردازیاں کرنے میں کس قدر بے باک تھے، بلکہ یہ سبق بھی ملتا ہے کہ لوگ اپنے ہم عصروں کی قدر و قیمت پہچاننے میں کتنے بے انصاف ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے سامنے تاریخ انسانی کی ایک ایسی عظیم شخصیت تھی جس کی نظیر نہ اس وقت دنیا بھر میں کہیں موجود تھی اور نہ آج تک پائی گئی ہے۔ مگر اُن عقل کے اندھوں کو اُس کے مقابلہ میں ایک عجمی غلام جو کچھ توراۃ و انجیل پڑھ لیتا تھا، قابل تر نظر آ رہا تھا اور وہ گمان کر رہے تھے کہ یہ گوہر نایاب اس کوئلے سے چمک حاصل کر رہا ہے۔

حضورؐ کے صاحب وحی ہونے کا ایک صریح ثبوت قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کا قصہ بیان کرنے کے بعد ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اے نبی، تم اُس وقت مغربی گوشے (یعنی طُورِ سینا کے دامن) میں موجود نہ تھے جب ہم نے موسیٰ کو یہ فرمانِ شریعت عطا کیا اور نہ تم اِس واقعہ کے شاہدین میں سے تھے۔ بلکہ اس کے بعد تمہارے زمانے تک ہم بہت سی نسلیں اُٹھا چکے ہیں اور ان پر بہت زمانہ بیت چکا ہے۔ تم اہلِ مَدیَن کے درمیان بھی موجود نہ تھے کہ ان کو ہماری آیات سُنا رہے ہوتے۔ مگر (اُس وقت کی یہ خبریں) بھیجنے والے ہم ہیں۔ اور (تم طُور کے دامن میں اُس وقت موجود نہ تھے جب ہم نے موسیٰ کو (پہلی مرتبہ) پکارا تھا۔

مگر یہ تمہارے رب کی رحمت ہے (کہ تم کو یہ معلومات دی جا رہی ہیں)، تاکہ تم ایک ایسی قوم کو خبردار کرو جس کے پاس تم سے پہلے کبھی خبردار کرنے والا نہیں آیا، شاید کہ یہ لوگ ہوش میں آئیں "۔

(القصص - ۴۴ تا ۴۶)

یہ تینوں باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت میں پیش کی گئی ہیں کہ یہ معلومات حاصل ہونے کا کوئی ذریعہ آپ کے پاس اللہ کی وحی کے سوا نہیں ہے۔ جس وقت قرآن مجید میں یہ باتیں کہی گئی تھیں اس وقت مکہ کے تمام سردار اور عام کفار اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ کسی نہ کسی طرح آپ کو غیر نبی اور معاذ اللہ جھوٹا مدعی نبوت ثابت کر دیں۔ ان کی مدد کے لیے یہود کے علماء اور عیسائیوں کے راہب بھی حجاز کی بستیوں میں موجود تھے۔ مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہیں عالمِ بالا سے آکر یہ قرآن نہیں سُنا جاتے تھے بلکہ اسی مکہ کے رہنے والے تھے اور آپ کی زندگی کا کوئی گوشہ آپ کی بستی اور آپ کے قبیلے کے لوگوں سے چھپا ہوا نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس وقت اس کھلے چیلنج کے انداز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت کے طور پر یہ تین باتیں ارشاد فرمائی گئیں، اُس وقت مکے اور حجاز اور پورے عرب میں کوئی ایک شخص بھی اُٹھ کر وہ بے ہودہ بات نہ کہہ سکا جو آج کے مستشرقین کہتے ہیں۔ اگرچہ جھوٹ گھڑنے میں وہ لوگ اِن سے کچھ کم نہ تھے، لیکن ایسا دروغِ بے فروغ آخر وہ کیسے بول سکتے تھے جو ایک لمحہ کے لیے بھی نہ چل سکتا ہو۔ وہ کیسے کہتے کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم فلاں فلاں یہودی عالموں اور عیسائی راہبوں سے یہ معلومات حاصل کر لاتے ہو، کیونکہ پورے ملک میں وہ اِس غرض کے لیے کسی کا نام نہیں لے سکتے تھے۔ جس کا نام بھی وہ لیتے فوراً ہی یہ ثابت ہو جاتا کہ اس سے آنحضرتؐ نے کوئی معلومات حاصل نہیں کی ہیں۔ وہ کیسے کہتے کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، تمہارے پاس پچھلی تاریخ اور علوم و آداب کی ایک لائبریری موجود ہے جس کی مدد سے تم یہ ساری تقریریں کر رہے ہو، کیونکہ لائبریری تو درکنار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آس پاس کہیں سے وہ ایک کاغذ کا پرزہ بھی برآمد نہیں کر سکتے تھے جس میں یہ معلومات لکھی ہوئی ہوں۔ مکے کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم لکھے پڑھے آدمی نہیں ہیں اور کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ نے کچھ مترجمین کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں جو عبرانی اور سُریانی اور یونانی کتابوں کے ترجمے کر کر کے آپ کو دیتے ہیں۔ پھر ان میں سے کوئی بڑے سے بڑا بے حیا آدمی بھی یہ دعوٰی کرنے کی جرأت نہ رکھتا تھا کہ شام و فلسطین کے تجارتی سفروں میں آپ یہ معلومات حاصل کر آئے تھے، کیونکہ یہ سفر تنہا نہیں ہوتے تھے۔ مکے ہی کے تجارتی قافلے ہر سفر میں آپ کے ساتھ لگے ہوتے تھے۔

اگر کوئی اس وقت ایسا دعویٰ کرتا تو سینکڑوں زندہ شاہد یہ شہادت دے دیتے کہ وہاں آپ نے کسی سے کوئی درس نہیں لیا۔ اور آپ کی وفات کے بعد تو دو سال کے اندر ہی رومی سلطنت سے مسلمان برسرپیکار ہو گئے تھے۔ اگر کہیں جھوٹوں بھی شام و فلسطین میں کسی عیسائی راہب یا یہودی مربی سے حضورؐ نے کوئی مذاکرہ کیا ہوتا تو رومی سلطنت رائی کا پہاڑ بنا کر یہ پروپیگنڈا کرنے میں ذرا دریغ نہ کرتی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) معاذ اللہ سب کچھ یہاں سے سیکھ گئے تھے اور مکے جا کر نبی بن بیٹھے۔ بغرض اس زمانے میں جبکہ قرآن کا یہ چیلنج قریش کے کفار و مشرکین کے لیے پیغامِ موت کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کو جھٹلانے کی ضرورت موجودہ زمانے کے مستشرقین کی بہ نسبت اُن لوگوں کو بدرجہا زیادہ لاحق تھی، کوئی شخص بھی کہیں سے ایسا کوئی مواد فراہم کر کے نہ لا سکا جس سے وہ یہ ثابت کر سکتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی کے سوا ان معلومات کے حصول کا کوئی دوسرا ذریعہ موجود ہے جس کی نشاندہی کی جا سکتی ہو۔ (باقی)

ٹورانٹو (کینیڈا) میں ایک مجلس

ابوالاعلیٰ مودودی

پچھلے دنوں مجھے بغرض علاج امریکہ جانا پڑا تھا۔ وہاں میرا قیام بفلو میں تھا جس سے کینیڈا کا شہر ٹورانٹو تقریباً سو میل کی مسافت پر واقع ہے۔ اس شہر کی ۲۱۷۵۰۰۰ آبادی میں مسلمانوں کی تعداد کم و بیش ۲۵ ہزار ہے۔ وہاں کے مسلمانوں کا تقاضا تھا کہ میں امریکہ چھوڑنے سے پہلے کم از کم ایک دفعہ ان کے ہاں ضرور حاضر ہوں۔ چنانچہ ۵ اگست ۷۴ء کی شام کو میں نے ان کی فرمائش پوری کی اور اسلامک سنٹر کے ہال میں ایک بڑے مجمع کو خطاب بھی کیا اور لوگوں کے سوالات کے جواب بھی دیے۔ اس مجلس کی روداد درج ذیل ہے:

بھائیو اور بہنو،

میں نے دل سے اس محبت کے لیے شکریہ ادا کرتا ہوں جس کے ساتھ مجھے یہاں آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں امریکہ اور کینیڈا کے سفر پر آیا بھی تو بیماری کی حالت میں آیا۔ اگر صحت کی حالت میں آتا اور میرے اندر طاقت ہوتی تو میں مختلف شہروں میں خود جاتا اور ہر جگہ اپنے مسلمان بھائیوں سے ملتا، ان کے حالات معلوم کرتا، ان کے سوالات کے جوابات دیتا اور جو کچھ مشورہ ان کو دے سکتا تھا وہ دیتا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ میں زیادہ محنت کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ سفر کرنے کے قابل بھی نہیں ہوں۔ بہت مشکل سے یہاں پہنچا ہوں۔ میں سب سے پہلے آپ کے سوالات کے جوابات دوں گا۔ پھر جو کچھ مجھے کہنا ہے وہ چند منٹوں میں عرض کر دوں گا۔ سوال و جواب کے طریقے کو میں نے اس لیے پسند کیا ہے کہ جو باتیں آپ کے دل میں کھٹکتی ہیں پہلے وہ مجھے معلوم ہو جائیں اور میں ان کا جواب دے کر آپ کی تشفی کرنے کی کوشش کروں۔

سوال نمبر ۱ ۔ سود کا مسئلہ

"کیا آپ سمجھتے ہیں کہ موجودہ زمانے کے بینکوں کا سود وہی چیز ہے جسے ربا کہا جاتا ہے؟ کیا مکان کا کرایہ سود پر قرض دینے سے مختلف کوئی چیز ہے؟ ایک ملک کی معیشت، مثلاً افراطِ زر، تفریطِ زر، اور قیمتوں وغیرہ کو سود کے تصور کے بغیر کنٹرول کیا جا سکتا ہے؟"

جواب: ۔ سب سے پہلے آپ کو یہ جان لینا چاہیے کہ قرآن سود کا کیا تصور پیش کرتا ہے۔ اُس میں بالکل واضح طور پر یہ بتا دیا گیا ہے کہ جو رقم کسی شخص نے قرض لی ہو اس سے زائد کوئی رقم اگر قرض دینے والا بطور شرط وصول کرتا ہے تو وہ "ربا" ہے۔ یہ ایک اصولی بات ہے جو قرآن میں بیان کر دی گئی ہے۔ اور یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ قرض دینے والے کو اپنے "راس المال" (یعنی اپنے دیے ہوئے اصل مال) سے زیادہ ایک پیسہ تک لینے کا حق نہیں ہے۔ اس معاملہ میں یہ بات خارج از بحث ہے کہ جو شخص سود پر قرض لے رہا ہے وہ آیا غریب ہے، یا قرض اِس غرض کے لیے لے رہا ہے کہ اس کو کاروبار میں لگائے یا صنعت میں یا کسی اور کام میں لگائے۔ ان حیثیتوں سے قرآن قطعی بحث نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اصل راس المال سے زیادہ وصول کرنے کو بجائے خود قطعی حرام قرار دیتا ہے۔ اس سلسلے میں مزید بات یہ سمجھ لیجیے کہ جو شخص قرض دیتا ہے وہ آخر پیشگی کیسے اندازہ لگا سکتا ہے کہ قرض لینے والا اس سے کتنا فائدہ اُٹھائے گا، بلکہ کوئی فائدہ اُٹھائے گا بھی یا نہیں، یا اُلٹا نقصان اُٹھائے گا۔ اُس کو اِن باتوں سے کوئی بحث نہیں ہے۔ وہ ایک مقرر منافع اور قانونی طور پر محفوظ منافع لینے کا ہر حال میں حقدار ہے۔ قرض لینے والے نے مثلاً اگر کسی مُردے کو دفن کرنے کے لیے قرض لیا تھا، تب تو سود اس کے لیے خسارہ ہی خسارہ ہے۔ لیکن اگر اس نے کاروبار میں لگانے کے لیے لیا تھا تو اُس کے لیے منافع ہی کی نہیں، نقصان سے بچنے کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ محنت، ذہانت اور وقت سب کچھ وہ صرف کرتا ہے۔ لیکن کاروبار کا سارا خطرہ (RISK) اُس کے ذمہ ہے اور قرض دینے والے کے لیے ایک مقرر منافع کی پوری ضمانت ہے۔ اس کو انصاف کون کہہ سکتا ہے؟

اب میں اس سوال کے دوسرے حصے کو لیتا ہوں۔ یعنی یہ کہ مکان کا کرایہ لینے اور قرض دیے ہوئے مال پر سود لینے میں کیا فرق ہے؟ اس سوال کو آپ صرف مکان کے کرائے تک محدود کیوں رکھتے ہیں؟

اگر کوئی شخص ٹیکسی چلا رہا ہے اور اس کا کرایہ لے رہا ہے تو اس پر بھی یہی سوال کیجیے کہ کیا وہ روپیہ جو اس نے ٹیکسی خریدنے اور اس کے چلانے میں لگایا ہے وہ اس کا سود وصول نہیں کر رہا ہے؟ اسی طرح سے آپ اُن تمام چیزوں کے بارے میں یہی سوال کر سکتے ہیں جو کرایہ پر دی جاتی ہوں، مثلاً فرنیچر وغیرہ۔ لیکن روپیہ قرض دینے، اور مکان یا کسی دوسری چیز کو کرایہ پر دینے میں صریح فرق ہے۔ جو نقد روپیہ کسی کو دیا جاتا ہے وہ تو خرچ ہو جاتا ہے۔ اس نقد روپے میں کوئی ٹوٹ پھوٹ یا فرسودگی نہیں ہوتی — وہ استعمال کرنے سے پرانا نہیں ہو جاتا۔ اس کو مرمّت اور دیکھ بھال کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کی وصول طلب تعداد جوں کی توں قائم رہتی ہے۔ لیکن مکان ہو یا کوئی اور چیز، اس میں ٹوٹ پھوٹ بھی ہوتی ہے، استعمال سے فرسودگی بھی لاحق ہوتی ہے، مرمت کی ضرورت بھی پیش آتی ہے اور جس حالت میں کرایہ دار کوئی چیز لیتا ہے وہ اسی حالت میں اسے مالک کو واپس نہیں کرتا بلکہ کسی نہ کسی نقصان کے ساتھ واپس کرتا ہے۔ اس لیے چیز کا مالک اس پر کرایہ لینے کا جائز حقدار ہے۔ اس نوعیت کے کرائے کو روپے کے کرائے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے شریعت میں سود اور استعمالی اشیاء کے کرائے میں واضح فرق کر دیا گیا ہے۔

سوال کا آخری حصہ یہ ہے کہ سود کے بغیر ایک ملک کی معیشت کو کس طرح کنٹرول کیا جا سکتا ہے؟ یہ سوال ایک غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جب کسی غلط طریقے پر دنیا کا نظام چل پڑتا ہے تو پھر آدمی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس کے بغیر نظام کیسے چل سکتا ہے؟ اس طرح کے نظام میں خرابی بس یہی ہے۔ ورنہ اسلام نے صدیوں تک دنیا کے بڑے حصے پر حکومت کی ہے۔ صدیوں تک اس کے تحت اندرونی اور بیرونی تجارت چلتی رہی ہے۔ مالی معاملات چلتے رہے ہیں۔ صنعتیں چلتی رہی ہیں۔ ہر قسم کا لین دین ہوتا رہا ہے۔ مگر کبھی سود لینے یا دینے کا سوال پیدا نہیں ہوا۔ یہ سودی نظام جس طرح موجودہ نظام مالیات پر مسلط ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے یورپ میں یہودیوں نے سود خواری شروع کی۔ کلیسا ابتدا میں اس کا مخالف تھا۔ سود کو وہ بھی حرام قرار دیتا تھا۔ لیکن یہودیوں کی وجہ سے جب سارے کاروبار میں سود گھستا چلا گیا تو کلیسا اس کے ساتھ مصالحت کرتا چلا گیا یہاں تک کہ آخر کار سود بالکل حلال ہو گیا اور ساری معیشت اسی پر چلنے لگی۔ ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس بات کے علمبردار ہیں کہ دنیا سے سود کو ختم کریں اور سارے مالی نظام کو غیر سودی طریقے پر چلائیں۔ ہمارے

پاس سودی نظام کے مقابلے میں منافع میں شرکت کا قاعدہ (PROFIT SHARING SYSTEM) ہے ۔ یعنی بجائے اس کے کہ سرمایہ دار قرض دے کر ایک مقررہ رقم وصول کرے، اس کو لازماً کاروبار میں روپیہ لگانا چاہیے اور جو منافع ہو اس کا متناسب حصہ لینا چاہیے ۔ اگر بڑے پیمانے پر بہت سے کاموں میں روپیہ لگایا جائے گا تو سارے کاموں میں نقصان ہی نہ ہوگا، بلکہ کسی میں نقصان اور کسی میں منافع ہوگا، اور مجموعی طور پر نفع نقصان سے زیادہ ہوگا ۔ لیکن اس صورت میں یہ بے انصافی نہ ہوگی کہ روپے والے کے لیے لازماً مقررہ منافع کی ضمانت ہو، اور سارا خطرہ (RISK) صرف کام کرنے والوں کے حصہ میں آئے ۔ ہمارے نزدیک دنیا کی تباہی کے اسباب میں سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ سودی نظام پورے مالیات پر قابض ہو گیا ہے ۔

سوال نمبر ۲ ۔ اسلامی نظام کے قیام کا طریقہ

"قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ۔ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اُن اولوالامر کی اطاعت کرو جو تم میں سے ہوں ۔ یہ حکم ایک ایسی منظم جماعت چاہتا ہے جو کسی خاص فرقے یا قوم تک محدود نہ ہو اور اسلام کی حدود میں رہ کر کام کرے ۔ آپ کا اس معاملہ میں کیا مشورہ ہے کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کیا طریقے اختیار کیے جائیں، خصوصاً کینیڈا کے تنظیمی ڈھانچے کے اندر؟"

جواب: ۔ یہ ایسا سوال ہے جس کا پورا جواب تو ایک کتاب ہی میں دیا جا سکتا ہے ۔ تاہم میں ایک مختصر سا جواب عرض کیے دیتا ہوں ۔ آدمی خواہ کینیڈا میں ہو، امریکہ میں ہو، چین میں ہو، یا کہیں بھی ہو، مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس کا اصل کام لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتاب اور آخرت پر ایمان لانے کی دعوت دینا ہے ۔ حالات اور مقامات کی مخصوص نوعیتوں کے لحاظ سے آپ اس دعوت کے لیے مناسب صورتیں اختیار کر سکتے ہیں، لیکن سب سے مقدم کام ایمان کی دعوت ہی ہے جس کے بغیر اسلامی تعلیمات کی دوسری تفصیلات کو پیش کرنا لاحاصل ہے ۔ اس غرض کے لیے ضروری ہے کہ معقول دلائل کے ساتھ لوگوں کو اچھی طرح اس بات پر مطمئن کر دیا جائے کہ وہ اِس دنیا میں خود مختار پیدا نہیں ہوئے ہیں، بلکہ اس دنیا کا ایک خدا ہے جس کے وہ بندے ہیں، جس نے ان کو پیدا کیا ہے اور جس کی اطاعت ان کو کرنی چاہیے ۔ پھر ان کو اس بات کا قائل کیا جائے کہ خدا کی اطاعت کرنے کا ذریعہ اس کے بھیجے ہوئے رسول کے طریقے کی پیروی کرنا ہے اور اس کتاب کی

پیروی کرنا ہے جو انسانوں کی ہدایت کے لیے خدا کی طرف سے بھیجی گئی ہے۔ پھر ان کو یہ سمجھانا ہے کہ انسان اس دنیا میں غیر ذمہ دار نہیں ہے، مر کر مٹی ہو جانے والا نہیں ہے، بلکہ اس کو دوبارہ ایک زندگی عطا ہونی ہے جس میں وہ خدا کے سامنے اپنے تمام اعمال کی جواب دہی کرے گا اور اپنا حساب دے گا۔ یہ چیزیں آپ کو لوگوں کے ذہن نشین کرانی پڑیں گی خواہ آپ کہیں بھی ہوں۔ آپ جس معاشرے میں بھی ہوں اُس کے انفرادی اور اجتماعی حالات کا جائزہ لے کر آپ کو بتانا ہوگا کہ لوگوں کی انفرادی زندگیوں اور اجتماعی نظام میں جو خرابیاں پائی جاتی ہیں ان کی بنیادی وجہ یا تو خدا کے متعلق ان کا غلط عقیدہ ہے، یا رسالت، یا کتاب، یا آخرت کے بارے میں وہ کوئی غلط عقیدہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یہ چار بنیادی چیزیں ہیں۔ ان کے بارے میں اگر کوئی شخص یا قوم کوئی غلط عقیدہ اختیار کرلے تو اس کی ساری زندگی غلط ہو جاتی ہے۔ یہاں آپ جس معاشرے میں رہتے ہیں اُس کے اندر آپ خود دیکھ رہے ہیں اور لوگوں کو دکھا سکتے ہیں کہ ہر طرف کیسی کیسی خرابیاں موجود ہیں۔ ترقی کے ساتھ ساتھ تنزل کے کون کون سے اسباب کس کس شکل میں یہاں خرابیاں پیدا کر رہے ہیں۔ یہ خرابیاں کس طرح سوسائٹی کا ستیاناس کر رہی ہیں۔ جرائم بڑھا رہی ہیں۔ خاندانی نظام کو تباہ کر رہی ہیں۔ نئی نسلوں کو بگاڑ رہی ہیں۔ اخلاقی قدروں کا خاتمہ کر رہی ہیں۔ اور بدکرداری کا وہ طوفان برپا کر رہی ہیں جو اس سے پہلے بہت سی تہذیبوں کو غارت کر چکا ہے۔ یہ ساری چیزیں اب اس قدر عیاں ہو چکی ہیں کہ ان کی نشاندہی کرنے میں آپ کو کوئی مشکل پیش نہیں آسکتی۔ انھیں پیش کر کے آپ اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو سمجھا سکتے ہیں کہ ان کی اصل وجہ خدا سے اور اس کی بھیجی ہوئی ہدایت سے اور آخرت کی جواب دہی کے احساس سے غافل ہو جانا ہے۔ اس حقیقت کو جب آپ معقول دلائل و شواہد کے ساتھ پیش کریں گے تو لازماً کچھ لوگ آپ کو ایسے مل جائیں گے جو ان کی صداقت تسلیم کرلیں گے۔ مکّے میں بھی اسی طرح ہوا تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کی طرف دعوت دی تو پہلے چند آدمیوں ہی نے اس کو مانا تھا۔ ایسے آدمی جب آپ کو مل جائیں تو انھیں ایک منظم جماعت بنائیے اور ان کے ذریعے سے دعوت کو مزید پھیلائیے۔ جتنے لوگ اس دعوت کو قبول کرتے جائیں گے وہ اس جماعت میں شامل ہوتے چلے جائیں گے۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب اس سوسائٹی کو عملاً تبدیل کر دینا ممکن ہوگا۔ اس کے لیے صبر چاہیے، مسلسل محنت چاہیے۔ عقلمندی کے ساتھ کام کرنا چاہیے۔ اور اس بات کی فکر نہ کرنی چاہیے کہ ہم کو اس میں کامیابی ایک صدی میں ہوگی یا دو صدیوں میں ہوگی۔

سوال نمبر ۳ - حرام مال سے خیرات

" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " جس نے جمع کیا مال حرام سے اور پھر اس کو صدقہ دے دیا تو اس کے لیے کوئی اجر نہیں بلکہ اس کا اجر اس کو جائے گا جس کا مال اس شخص نے چرا لیا اور اس کو صدقہ کر دیا"

اس حدیث کی رو سے یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ وہ بینک سے سود لے اور پھر غریبوں میں تقسیم کر دے ؟ میں سمجھتا ہوں کہ شاید آپ نے اس فعل کو کسی عارضی حل کے طور پر پیش کیا ہوگا - کیا آپ اس کی وضاحت فرمائیں گے ؟"

جواب :- میں بارہا اس بات کو واضح کر چکا ہوں کہ بینک کے سودی اکاؤنٹ میں اس غرض سے روپیہ رکھنا کہ جو سود اس سے وصول ہوگا اس کو غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے گا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص جیب اس لیے کاٹے کہ جو روپیہ اسے ملے گا اس کو وہ کسی یتیم یا کسی بیوہ کو دے دے گا ۔ جس طرح جیب کاٹ کر خیرات کرنا غلط ہے اسی طرح بینک سے سود لے کر خیرات کرنا بھی غلط ہے ۔ میری جس بات کا آپ حوالہ دے رہے ہیں وہ دراصل یہ ہے کہ اگر آپ غلطی سے بینک کے سودی حساب میں روپیہ رکھ چکے ہوں اور اس پر آپ کو سود مل گیا ہو تو اس کو خود نہ استعمال کیجیے بلکہ غریبوں کو دیدیجیے ۔ یہ بات میں اس وجہ سے کہتا ہوں کہ سود کے ذریعے سے جو روپیہ آتا ہے وہ صرف اسی شخص کے لیے حرام ہے جس نے سودی حساب میں روپیہ رکھا اور اس کو وصول کیا ۔ لیکن اگر وہ شخص کسی اور آدمی کو یہ روپیہ ہبہ کر دیتا ہے یا کسی چیز کی اجرت یا قیمت میں دے دیتا ہے تو اس شخص کے لیے یہ حرام نہیں ہے کیونکہ اس کو جائز طریقے سے یہ روپیہ ملا ہے اور سود لینے والے کے پاس یہ ناجائز طریقے سے آیا تھا ۔ مثال کے طور پر سود لینے والا آدمی اگر کسی ٹیکسی پر سوار ہوتا ہے اور ٹیکسی والے کو اجرت دیتا ہے تو وہ روپیہ ٹیکسی والے کے لیے حرام نہیں ہے ، البتہ اس شخص کے لیے حرام ہے جس نے سودی روپے سے ٹیکسی پر سفر کیا ۔ اسی طرح اگر وہ کسی کو ہبہ کر دیتا ہے یا صدقہ کر دیتا ہے تو یہ ایک شخص سے دوسرے کی طرف مال منتقل ہونے کی جائز شرعی صورتیں ہیں ، اس لیے صدقہ یا ہبہ لینے والے کے لیے یہ روپیہ حرام نہیں ہے ۔

سوال نمبر ۴ - جماعتِ اسلامی جمہوری طریق کار کیوں اختیار کرتی ہے ؟

"پاکستان کی جماعت اسلامی نے اقتدار کی منزل تک پہنچنے کے لیے جمہوری طریقہ اختیار کیا ہے، یعنی ایک مغربی طرز کے جمہوری نظام میں مغربی طرز کے انتخابات کے ذریعہ سے اکثریت حاصل کرنا۔ دعوت اسلامی کے لیے اس طریقہ کے موافق و مخالف دلائل کیا ہیں؟ کیا جماعت نے اس سے پہلے کی تحریکوں کے تجربات سے اس معاملہ میں کوئی فائدہ اُٹھایا ہے اور کس طرح؟ ایسے حالات میں دعوت کے لیے کیا طریق کار مناسب ہو گا جہاں کے حکمران بالکل مطلق العنان ہیں اور بنیادی انسانی حقوق تک کا کوئی لحاظ نہیں کرتے۔"

جواب:- یہ بھی ایک بڑی تفصیل طلب بحث ہے۔ مگر میں اختصار کے ساتھ آپ کے سوال کا جواب دوں گا۔ جماعت اسلامی جس ملک میں کام کر رہی ہے اس کے حالات کے لحاظ سے اس نے اپنا طریق کار اختیار کیا ہے۔ کوئی دوسرا آدمی جو اسلامی دعوت کے لیے کسی اور ملک میں کام کر رہا ہو اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ ہمارے طریقے کی پیروی کرے۔ وہ اپنے ملک کے حالات کے لحاظ سے کوئی دوسرا طریق کار اختیار کر سکتا ہے۔ ہم اس کے لیے یہ لازم نہیں کر سکتے کہ وہ ہمارے ہی طریقے کی پیروی کرے۔ ہم اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے کسی قسم کی خفیہ تحریک کا طریقہ اختیار کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کے نتائج اچھے نہیں ہوتے۔ ہم اس کو بھی صحیح نہیں سمجھتے کہ کسی طرح کی سازشیں کر کے کوئی فوجی انقلاب لانے کی کوشش کی جائے اور اس طریقے سے اسلامی حکومت قائم کی جائے۔ کیونکہ اس کا نتیجہ پھر یہ ہو گا کہ جس طرح ایک سازش کے نتیجے میں اسلامی حکومت قائم ہو گی اسی طرح ایک دوسری سازش کے نتیجے میں اس کا تختہ اُلٹ کر کوئی اور حکومت قائم ہو جائے گی۔ ہمارے نزدیک صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ایک کھلی اور علانیہ دعوت سے اپنا ہم خیال بنائیں۔ اس میں وقت کی حکومت خواہ کتنی ہی رکاوٹیں ڈالے، ہر طرح کی تکلیفوں کو، ہر طرح کے نقصانات کو، ہر طرح کی سزاؤں کو برداشت کر لیا جائے اور اپنی دعوت کو برابر جاری رکھا جائے، یہاں تک کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ہمارے ہم خیال ہو جائیں۔ جب لوگ ہمارے ہم خیال ہو جائیں گے تو ہم انشاءاللہ جمہوری طریقے سے ہی اپنے ملک میں اسلامی انقلاب لے آئیں گے۔

سوال نمبر ۵ - کیا زکوٰۃ ایک ٹیکس ہے؟

"کیا زکوٰۃ ایک طرح کا انکم ٹیکس نہیں ہے؟ کیا ہم زکوٰۃ کو فلاحِ عامہ کے کاموں مثلاً مدارس اور ہسپتالوں کے لیے استعمال نہیں کر سکتے؟"

جواب:- زکوٰۃ کو ٹیکس قرار دینا سرے سے ہی غلط ہے - وہ تو اسی طرح ارکانِ اسلام میں سے ایک رکن ہے جس طرح نماز ایک رکن ہے، حج ایک رکن ہے، روزہ ایک رکن ہے - زکوٰۃ اِنہی عبادتوں کی طرح ایک عبادت ہے اور اِس عبادت کو مقرر کرنے کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے اس کے مصارف بھی متعین کر دیے ہیں جن کے سوا کسی اور مصرف میں اسے استعمال نہیں کیا جا سکتا - آپ جتنے ٹیکس دیتے ہیں، خواہ وہ انکم ٹیکس ہو یا کسی اور قسم کا ٹیکس، ہر ایک کا نفع آپ کی طرف پلٹ کر آتا ہے - لیکن زکوٰۃ ایک ایسی چیز ہے جس کا نفع آپ کی طرف آخرت میں پلٹ کر آئے گا، اِس دنیا میں کسی طور پر بھی اس کی منفعت حاصل ہونے کی امید پر آپ زکوٰۃ دیں گے تو اسے ضائع کر دیں گے - اس دنیا میں آپ بس خدا کے بتائے ہوئے حق داروں کو زکوٰۃ دے دیجیے اور سمجھ لیجیے کہ یہ نیکی خدا کے دفتر میں درج ہو گئی - اگر آپ اس سے سڑکیں بنائیں گے یا ریلیں بنائیں گے یا مدرسے اور ہسپتال بنائیں گے تو ان سے امیر اور غریب سب فائدہ اُٹھائیں گے، درآنحالیکہ زکوٰۃ غریبوں کے لیے ہے، امیروں کے لیے نہیں ہے - اِن چیزوں سے آپ خود بھی فائدہ اُٹھائیں گے درآنحالیکہ زکوٰۃ سے آپ کو خود فائدہ اُٹھانے کا حق نہیں پہنچتا - اس لیے زکوٰۃ کو صرف عبادت سمجھ کر ادا کیجیے، اس کو رکنِ اسلام سمجھیے، انکم ٹیکس نہ سمجھیے - ٹیکس کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ خواہ کتنے ہی انصاف کے ساتھ لگایا جائے اور کتنی ہی ایمانداری سے وصول اور خرچ کیا جائے، بہرحال جن لوگوں پر اس کا بار پڑتا ہے وہ کبھی اس کو خوشدلی سے نہیں دیتے بلکہ اس سے بچنے کی بے شمار راہیں تلاش کرتے ہیں - اب کیا خدا کی فرض کی ہوئی ایک عبادت کو بھی ٹیکس سمجھ کر اس کے ساتھ آپ یہی سلوک کرنا چاہتے ہیں؟ یہ طرزِ عمل آپ زکوٰۃ کے ساتھ اختیار کریں گے تو اپنے مال کے ساتھ اپنے ایمان کو بھی کھو دیں گے - یہ تو وہ چیز ہے جو خوشدلی سے دینی چاہیے، خدا کی خاطر دینی چاہیے، جتنی آپ پر واجب ہو اس سے بھی کچھ بڑھ کر دینا چاہیے، تاکہ خدا کی خوشنودی اور زیادہ حاصل ہو سکے -

سوال نمبر ۶ - انشورنس

"کیا آپ صحت، زندگی، یا حادثات کے بیمے کو ایک طرح کا بیت المال نہیں سمجھتے؟ اس میں تو ہر شخص جو اپنے آپ کو انشور کراتا ہے وہ ایک طرح کا چندہ دیتا ہے، اور حاجت مند اس کا فائدہ حاصل کرتے ہیں"۔

جواب:- آپ نے تو انشورنس کا کاروبار کرنے والوں کو بالکل جنت ہی میں پہنچا دیا۔ یہ غلط فہمی آپ کو کہاں سے لاحق ہوگئی کہ یہ ایک بیت المال ہے جس میں مال دار ایک چندہ دیتا ہے اور حاجت مند لوگ اس کا فائدہ اُٹھاتے ہیں؟ حالانکہ یہ ایک باقاعدہ کاروبار (بزنس) ہے جس کو سرمایہ دار اپنے فائدہ کے لیے چلاتے ہیں نہ کہ آفت رسیدہ لوگوں کے فائدے کے لیے۔ سرمایہ داروں نے سارے معاشرے کی بچتیں (SAVINGS) کھینچ کر اپنے قبضے میں لے لینے کے لیے دو طریقے اختیار کیے ہیں۔ ایک بینک جو سود کا لالچ دے کر لوگوں کے بچے ہوئے مال (SAVINGS) اپنے قبضے میں لیتا ہے۔ اور دوسرے انشورنس کمپنی، جو لوگوں کو نقصانات کی صورت میں مدد دینے کا لالچ دے کر پریمیم کی صورت میں ان کا سرمایہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ان دو طریقوں سے تمام قوم کے بچے ہوئے مال ان سرمایہ داروں کے پاس جمع ہو جاتے ہیں اور پھر یہ اپنی شرائط پر اس ساری دولت کو معاشرے کے اُن کاموں میں لگاتے ہیں جو ان کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید ہوں۔ بینک کی طرح انشورنس کمپنی بھی کوئی فلاحِ عام کا ادارہ نہیں ہے۔ کمپنی والے پورا حساب لگا کر دیکھتے ہیں کہ جتنے لوگ ہم سے انشور کراتے ہیں ان سے ہم کو پریمیم کتنا وصول ہوگا اور کتنے نقصانات کی تلافی کرنے کے لیے ہم کو کتنی رقم دینی ہوگی۔ اس حساب سے وہ یہ اندازہ کرلیتے ہیں کہ کتنا نفع ہم کو حاصل ہوگا۔ جب تک انہیں بھاری نفع کی امید نہ ہو وہ انشورنس کا کاروبار ہرگز نہ کریں۔ اب آپ خود بتائیے کہ اگر وہ آپ کے ایسے ہی خیر خواہ ہیں اور خدمتِ خلق ہی کے لیے کام کر رہے ہیں تو اتنے بھاری منافع کیسے کماتے ہیں؟ اتنی عظیم الشان کوٹھیاں کیسے بناتے ہیں؟ اتنے عالی شان دفتر کیسے قائم کرتے ہیں؟ اتنی بڑی بڑی تنخواہوں والے ملازم اور ایجنٹ کیسے رکھتے ہیں؟ کیا یہ سب کچھ اپنی جیب سے خیرات کے طور پر ہو رہا ہے یا آپ کی جیب سے وصول کیا جاتا ہے؟ یہ بیت المال نہیں ہے، محض ناجائز نفع اندوزی ہے۔

سوال نمبر ۷ - امریکہ اور کینیڈا میں مسلمان بچوں کی تعلیم کا مسئلہ

"جماعت اسلامی امریکہ اور کینیڈا میں ہمارے بچوں کی تعلیم کے لیے نصابی کتابیں کس طرح فراہم کرسکتی ہے ؟"

جواب: - جماعت اسلامی اس خدمت کی خود خواہشمند ہے - آپ اس کو بتائیں کہ آپ کس قسم کے لٹریچر کی ضرورت محسوس کرتے ہیں - میں تو اب واپس جارہا ہوں - آپ اپنی ضروریات سے مرکز جماعت اسلامی لاہور کو آگاہ کریں اور تفصیل سے بتائیں کہ آپ کو کس طرح کا لٹریچر درکار ہے - انشاء اللہ ہم اسے فراہم کریں گے - یا اگر وہ موجود نہ ہوگا تو تیار کرائیں گے اور یا تو خود چھپوائیں گے یا آپ کو بھیج دیں گے تاکہ آپ خود چھپوالیں -

سوال نمبر ۸ - ترقی یافتہ قوموں کے لیے اسلام میں کشش کیا ہے ؟

" ایک غیر مسلم کے لیے اسلام میں کیا کشش ہے جبکہ اچھے کیرکٹر کے لوگ غیر مسلموں میں بھی پائے جاتے ہیں ؟ اور مسلمان تو آج کی دنیا میں ایک شکست خوردہ قوم سمجھے جاتے ہیں" -

جواب: - ایک غیر مسلم کے سامنے اسلام بحیثیت ایک دین کے آئے تو اس کو یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ پیش کرنے والے کون ہیں - اس کو یہ دیکھنا چاہیے کہ پیش کیا چیز کی جارہی ہے اور آیا وہ حق ہے یا نہیں ؟ اگر وہ مطمئن ہوجائے کہ جو چیز میرے سامنے پیش کی جارہی ہے وہ حق ہے تو اسے قبول کرنا چاہیے اور افسوس کرنا چاہیے اُس شخص کے حال پر جو حق اس کے سامنے پیش کر رہا ہے مگر خود اس کی پیروی نہیں کر رہا - اُسے پیش کرنے والے کو اس بات پر شرم دلانی چاہیے اور خود اس چیز کی پیروی اختیار کرنی چاہیے جسے وہ حق سمجھتا ہے - یہ کوئی بات نہیں ہے کہ ہم مسلمان چونکہ ایک شکست خوردہ قوم ہیں اس لیے ہماری پیش کردہ اسلامی تعلیمات کو دنیا قبول نہیں کرے گی - مسلمان آج اتنے شکست خوردہ تو نہیں ہیں جتنے تاتاری حملے کے وقت ہوتے تھے - اُن وحشیوں نے اُس وقت ہمارے بڑے بڑے مراکز تہذیب و تمدن کو برباد کر دیا تھا - بڑی بڑی لائبریریاں تباہ کر دی تھیں - لاکھوں مسلمانوں کو قتل کر دیا تھا - اور ماوراء النہر سے لے کر مصر کے قریب تک ساری اسلامی دنیا کو تہس نہس کر ڈالا تھا - لیکن وہی تاتاری جنہوں نے مسلمانوں پر اس طرح سے غلبہ حاصل کیا تھا آخر کار خود مسلمان ہوگئے - انہوں نے اُسی شکست خوردہ قوم کے دین کو قبول کر لیا جس نے ان کے آگے ہتھیار ڈالے

تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا ایک شکست خوردہ قوم ہونا اس امر میں مانع نہیں ہے کہ آپ دنیا کے سامنے اسلام پیش کریں۔ اسلام کو معقول طریقے سے پیش کیجیے اور ساتھ ساتھ یہ کوشش کیجیے کہ آپ کی زندگی بھی اس کے مطابق ہو تاکہ لوگوں کے سامنے آپ اپنی بُری مثال پیش نہ کریں۔ لیکن اگر فرض کیجیے کہ آپ اپنی زندگی نہیں بدلتے تو پھر بھی اسلام کو اُس کی اصل صورت میں اللہ کے بندوں تک پہنچانے میں کوتاہی نہ کیجیے۔ کوئی معقول آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں ایک حق بات کو اس لیے قبول نہیں کرتا کہ اس کا پیش کرنے والا خود اس پر نہیں چل رہا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی لوگوں کے سامنے حفظانِ صحت کے اصول بیان کر رہا ہو اور یہ بتا رہا ہو کہ تمہاری صحت اِن اصولوں کی پیروی کرنے سے ٹھیک رہ سکتی ہے، اور سننے والا یہ دیکھے کہ یہ شخص خود حفظانِ صحت کے اصولوں کی خلاف ورزی کر کے اپنی صحت خراب کر رہا ہے، تو وہ یہ دلیل نہیں دے سکتا کہ چونکہ تم خود ان اصولوں کی خلاف ورزی کر کے اپنی صحت بگاڑ رہے ہو، اس لیے میں بھی حفظانِ صحت کے یہ اصول قبول نہیں کرتا۔ عقلمند آدمی تو ایسی بات کبھی نہ کہے گا۔

سوال نمبر ۹ ۔ اسلام کی ابتدا غربت سے ہونے کا مطلب

"اس حدیث کا کیا مطلب ہے، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بَدَ أَ الاسلام غریباً وسیکون غریباً فطوبی للغرباء۔ اسلام کی ابتدا غربت سے ہوئی اور پھر ایک وقت آئے گا کہ وہ پھر غریب ہو جائے گا۔ پس خوشخبری ہو غربا کے لیے۔"

جواب:۔ اس حدیث کو سمجھنے میں عام طور پر لوگوں کو جو مشکل پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ لفظ غریب کو اردو محاورے کے مطابق مفلس کے معنی میں لے لیتے ہیں۔ حالانکہ غریب کا لفظ عربی زبان میں اجنبی اور نامانوس چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اُردو میں بھی جب ہم عجیب و غریب بولتے ہیں تو اس کے معنی قریب قریب وہی ہوتے ہیں جو عربی میں لفظِ غریب کے ہیں۔ ہر وہ شخص یا کام یا چیز غریب ہے جس سے لوگ آشنا نہ ہوں، جسے نرالا سمجھ کر لوگ اس سے اُپراتے ہوں، جو اُن کے ذوق اور پسند کے مطابق نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو جب اوّل اوّل پیش کیا گیا تو عموماً لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ ایک نرالی بات کہی جا رہی ہے، ہم تو اس سے بالکل مانوس نہیں ہیں، ہمارے باپ دادا نے کبھی ایسی باتیں نہیں سُنی تھیں۔ پس اسلام ابتدا میں بالکل اجنبی تھا اور لوگ اس کو ایک نرالی اور ناموافق مزاج چیز سمجھتے تھے۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اسلام ہی مقبول عام ہو گیا اور رفتہ

چیز اجنبی ہو گئی جو اسلام کے خلاف تھی۔ اس کے بعد ایک وقت پھر ایسا آئے گا جب اسلام دنیا میں غریب ہو جائے گا۔
یعنی اُسی طرح سے غیر مانوس اور اجنبی ہو گا جس طرح وہ ابتدا میں تھا۔ اور وہ وقت یہی ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ آج ایک مسلمان لوگوں کے سامنے نماز پڑھتے ہوئے شرماتا ہے۔ اپنے اسلامی لباس میں چلتے پھرتے شرم محسوس کرتا ہے۔ ایک مسلمان عورت اسلامی احکام کی اطاعت میں زندگی بسر کرتے ہوئے شرم محسوس کرتی ہے۔
گناہ کرنے والا آج جری و بیباک ہے اور ایک صالح مسلمان کی سی زندگی بسر کرنے والا اپنی جگہ خوف زدہ بیٹھا ہوا ہے کہ معلوم نہیں میں سوسائٹی میں کیسے قبول کیا جاؤں گا۔ اُس کا جینا مشکل ہے۔ ہر چیز اُس کے مزاج کے خلاف ہے۔ ہر چیز اُن اصولوں کے خلاف ہے جن کو وہ حق مانتا ہے۔ وہ سب کچھ دنیا میں دھڑلے سے ہو رہا ہے جس کے متعلق اُس کا عقیدہ ہے کہ یہ بیحیائی ہے، فحش ہے، بے شرمی ہے، گناہ ہے، حرام ہے۔ جن چیزوں کو وہ سمجھتا ہے کہ یہ فرض ہیں ان کو بجالانا مشکل ہو رہا ہے اور جن چیزوں کو وہ سمجھتا ہے کہ یہ حلال ہیں ان کا استعمال اس کے لیے دشوار ہو رہا ہے۔ یہی وہ وقت ہے جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ اسلام ایک دفعہ پھر غریب اور نامانوس ہو کر رہ جائے گا۔ اور ایسے ہی حالات کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ خوشخبری ہے غریبوں کے لیے، یعنی اُن لوگوں کے لیے جو ایسے حالات پیدا ہو جانے کے بعد بھی اسلام کے اصولوں پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں اور اس کی کچھ پروا نہ کریں کہ دنیا کیا کہتی ہے۔ دُنیا اُن کا مذاق اُڑائے، یا اُن پر ہنسے، یا ان کی تذلیل و تحقیر کرے، وہ بہر حال اسلام کے اصولوں سے نہ ہٹیں اور اجنبی بن کر رہ جانا قبول کر لیں۔ ان کے لیے حضورؐ نے جو خوشخبری دی ہے وہ آخرت میں کامیاب ہونے کی بشارت تو بہر صورت ہے، خواہ دنیا میں وہ کامیاب ہوں یا نہ ہوں۔ مگر یہ دنیا میں بھی کامیاب ہونے کی بشارت ہو سکتی ہے اگر ایسے "غریب" لوگ مل کر ایک مضبوط اور منظم جماعت بن جائیں اور اسلام کے اصولوں کو غالب کرنے کے لیے اُسی طرح جان لڑا دیں جس طرح ابتدائے اسلام میں اہل ایمان نے اپنی جانیں لڑائی تھیں۔ اس صورت میں ان کے لیے خوشخبری ہے کہ آخر کار اسلام کی غربت ختم ہو جائے گی اور وہ پھر دنیا میں ایک غالب قوت بن جائے گا۔ اس تشریح سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اسلام کی غربت کے زمانے میں غریب بن کر رہ جانے والوں کے لیے ہر حال میں بشارت ہی بشارت ہے، خواہ وہ دنیا میں اکیلے غریب رہ جائیں، یا اس غربت کی حالت میں منظم ہو کر دنیا کی غالب جاہلیت سے لڑیں اور اس پر اسلام کو غالب کرنے کے لیے اپنی تمام کوششیں صرف کر دیں، یا اس کوشش میں لڑتے لڑتے شہید ہو جائیں۔

(باقی)

ایمانی حمیّت اور جنگِ زرگری

سید اسعد گیلانی

مال و دولت ایمان کے منافی نہیں ہے، لیکن کثرتِ مال ایمان کی بہت بڑی آزمائش ضرور ہے، جو خدمتِ دین فقر و فاقہ کی حالت میں انجام پاتی ہے وہ خوشحالی اور کشادگی میں سرانجام نہیں پاتی۔ ہر تحریک میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ کثرتِ زر کی موجودگی میں ایک انسان صرفِ مال ضرور کر لیتا ہے لیکن جسم و جان کی توانائیاں نصب العین کے لیے کھپانا اس کے لیے دشوار تر ہو جاتا ہے۔ پھر وہ نصب العین جو تحریک کی صورت میں وقت، محنت اور سوچ بچار کا تقاضا کرے اس کے تقاضے پورے کرنا اس لیے بھی دشوار ہوتا ہے کہ یہی تقاضے حصولِ مال کی جدوجہد بھی کرتی ہے۔

کسی نصب العین کے لیے اجتماعی طور پر ایک منظم، مسلسل اور متحرک جدوجہد کا نام ہی تحریک ہے۔ نظم، تسلسل اور حرکت کے بغیر کوئی جدوجہد تحریک نہیں کہلا سکتی۔ ایک جامد فرقہ اور ایک جاندار انقلابی گروہ کا بنیادی فرق یہی تین اجزا ہوتے ہیں۔

اجتماعیت، ایک تحریک کی جسم و جان ہوتی ہے۔ اگر آج کسی نصب العین کی خدمت کا اعلان ایک زبان، دو ہاتھوں اور دو قدموں نے کیا ہے، تو وہ نصب العین اور وہ اعلان اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ کچھ اور زبانیں بھی اس کے لیے بولیں، کچھ اور ہاتھ بھی آگے بڑھیں، اور کچھ اور قدم بھی اس راہ کے کانٹوں سے آشنا ہوں۔ جب تک یہ نہیں ہوتا کسی تحریک کو "فتح مکہ" تو کیا کوئی "معرکۂ بدر" بھی پیش نہیں آسکتا۔

چنانچہ ہر تحریک چاہے وہ کسی مقصد کے لیے بھی برپا ہوئی ہو، بہر حال وہ نظم چاہتی ہے، حرکت چاہتی ہے تسلسل چاہتی ہے اور ایک اجتماعی جدوجہد چاہتی ہے۔ جدوجہد صوفے پر بیٹھ کر چائے پینے اور اشعار گنگنانے کا نام نہیں ہے، جدوجہد کمروں میں بیٹھ کر نکمی فضول گوئی یا بحث مباحثے کا نام بھی نہیں اور نہ

ہی بہ سال چھ ماہ میں کسی لگے بندھے پروگرام میں شرکت کا نام ہے بلکہ جد وجہد تو مسلسل کوشش، اور رکاوٹوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھنے اور اپنے نصب العین کی راہ میں ہر رگڑ سہنے، ہر زخم برداشت کرنے اور ہر نوکِ سناں کو اپنے سینے پر لینے کا نام ہے۔ یہ ایک شدید اجتماعی لگن ہے اور اس لگن کے لیے اپنا ہر فائدہ سرِ بازار ٹھکرا دینا ہی خلوصِ مقصد کا واحد معیار ہے۔ ہر بلند نصب العین اپنے پیرو سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کی دوسری تمام دلچسپیوں اور چھوٹے بڑے مقاصد پر اسے کلی اختیار دے دے تاکہ اس کے اپنے پیرو کی کوئی دلچسپی اور اس کا کوئی دوسرا مقصد کسی وقت اس کے مقابلے میں نہ آ کھڑا ہو۔ جس نسبت سے وہ پیرو یہ اختیار اپنے نصب العین کو دیتا ہے اسی نسبت سے وہ نصب العین اس پیرو کو اپنی فہرستِ عشاق میں درجہ اور رتبہ دیتا ہے۔ ہر نصب العین کا پہلا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ جب وہ اپنے چاہنے والے کو بلائے، تو آنے والا اپنی متاعِ حیات کے ساتھ آئے، اپنی جائیداد، اپنا مال، اپنے کاروبار، اپنے تعلقات، اپنی دوستیاں اور اپنے رشتے تمام اس نصب العین کی راہ میں جھونک دے۔ موقع آئے تو اپنے بیٹے پر تلوار کھینچ لے، اپنے گمراہ ماموں کو بھی راہ میں حائل دیکھ کر تلوار سے علیحدہ کرے۔ اپنے سرگراں باپ کے نیچے سے بھی فرش کھینچ لے، اپنے منحرف بیٹے کو بھی طوفانِ آب میں ڈوب جانے دے۔ اپنی سرکش بیوی کو بھی پتھراؤ کا شکار ہو جانے دے۔ اور اگر ضرورت پڑے تو خود بھی نارِ نمرود میں کود جائے۔ جب کیفیت یہ ہو تو ہر نصب العین اپنے ایسے پیرو کو اپنی آغوشِ عزت میں لینے کے لیے ہر وقت آمادہ رہتا ہے۔ تحریک جو عمومی تقاضے اپنے کارکن سے کرتی ہے۔ وہ تقاضے پورے کیے بغیر یہ ناممکن ہے کہ کوئی کارکن اس تحریک میں مقامِ افتخار پا سکے اور اگر کسی گھپ جوڑ سے پا لے تو اس پر زیادہ عرصہ قائم رہ سکے، منافقت اور بناوٹ کے لیے کسی اجتماعی زندگی میں کوئی مستقل مقام نہیں ہوتا۔

زر ـــــ زندگی کی عمومی ضروریات کو فراہم کرنے کا ذریعہ، خواہشاتِ نفس کی تکمیل کا ایک سبب اور حیاتِ انسانی کے حیوانی تقاضوں کو بہ سہولت پورا کرنے کا ایک آلہ ہے۔ نفس کی عام خواہشات ہر شخص کی اپنی ذات سے متعلق ہوتی ہیں اور ان کی تکمیل کی جد وجہد میں بھی وہ خود ہی ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ سوائے اس کے کہ اسے خارجی ماحول میں سے بعض ذرائع ممد ثابت ہو جائیں۔ یہ تقاضے صرف انسان کی ذات سے اپیل کرتے ہیں اور اسے آمادہ کرتے ہیں کہ انہیں پورا کرنے میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لے۔ اور بہتر سے بہتر ذرائع ان کی تکمیل کے لیے فراہم کرے۔ چنانچہ اگر انسان اپنی ذات کے ان حیوانی تقاضوں

پر ان کے جائز حقوق سے زیادہ توجہ دینے لگتا ہے تو ان تقاضوں کی فراہمی کے لیے جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت وہ محسوس کرتا ہے وہ زر ہے۔ انسانی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے خوراک کی، اس کی نسل جاری رکھنے کے لیے جنسِ مخالف کی اور تھکا دینے والے کام کے مقابلے میں اپنی طاقت بحال رکھنے کے لیے آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں ایک معقول حد تک پورا کرنا، اپنے جسم کے ساتھ صحیح عدل ہے لیکن یہ تقاضے ایسے نہیں ہیں کہ اپنی کوئی انتہا رکھتے ہوں، بلکہ اگر انسان صرف انہیں کی تکمیل پر کمربستہ ہو جائے تو ساری دنیا کے ذرائع و وسائل بھی اس کے ان حیوانی تقاضوں کو مکمل تسکین نہیں بخش سکتے۔ جو لوگ ان تقاضوں کی تکمیل میں سرگرداں ہو جاتے ہیں۔ ان کا گوہرِ مقصود صرف روپیہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ یہی ان کی تکمیل کا واحد اور مشترک ذریعہ ہے۔

جو شخص روپے کے حصول میں زندگی کی تمام قوتیں سمیٹ کر مصروف ہو جائے اور اپنی تمام محنت، وقت اور ذہانت اس پر صرف کرنے لگے یقیناً اس نے اپنے حیوانی تقاضوں کو ان کے جائز حدود سے زیادہ حقوق دینے کا عزم کر لیا ہے اور ان کی جائز حدود سے آگے بڑھ کر انہیں پورا کرنے کی سعی میں مصروف ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص زندگی کے ارفع اور بلند نصب العین کو چھوڑ کر اپنے دسترخوان کو وسعت دینے کے پیچھے لگ گیا، جنسی معاملات میں فطری حدود کو پھاند گیا اور آرام و آسائش میں معقولیت سے گذر گیا، گویا اس نے اعلان کر دیا کہ وہ اپنی خواہشاتِ نفسانی کو بہتر سے بہتر طور پر زیادہ سے زیادہ حد تک پورا کرنے کا عزم کر چکا ہے، ایسی حالت میں اس سے کسی معاشرے کے اجتماعی مفاد کے لیے شریفانہ اور معقول رویہ اختیار کرنے کی توقع رکھنا حماقت ہوتا ہے۔ ایسے آدمی کا مرکز اس کی اپنی ذات ہوتی ہے اور وہ ساری عمر اپنی ذات کی طرف ہی سفر کرتا رہتا ہے۔

اپنے حیوانی تقاضوں کو پورا کرنے کے شوق میں زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کا مشتاق شخص اکثر اوقات مجرد دولت کمانے کے جنون میں ہی مبتلا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کا دولت کمانا محض تسکینِ ذوق کی بات ہوتا ہے۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ وہ روپیہ کہاں صرف ہوگا، کن مقاصد پر صرف ہوگا۔ اسے کون لوگ صرف کریں گے اور وہ کیونکر صرف ہوگا۔ اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ دولت دن بدن اس کی تجوری میں بڑھتی جائے اور بنکوں میں اس کے حسابات پھولتے چلے جائیں۔

خواہش زر کا ابتدائی جذبہ ہی چونکہ احساسِ تحفظِ ذات کے تحت پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے اس جذبے

کی افزائش انسان میں شدید قسم کی انفرادیت پیدا کر دیتی ہے۔ ایک خوفناک قسم کی خود غرضی اور ایک مکروہ قسم کی سنگدلی انسان میں پرورش پانے لگتی ہے۔ انسان اجتماعی رشتے توڑ کر صرف اپنی ذات پر ہی اپنی ساری قوتیں اور اپنی ساری توجہات اور اپنی ساری محنتیں مرکوز کر دیتا ہے اسے "صرف" کی ہر مد سے نفرت اور "آمد" کی ہر مد سے الفت ہوتی ہے۔ صرف کی ہر مد سے نفرت کا جذبہ جیسے جیسے پرورش پاتا ہے ویسے ویسے اس کے ضمیر میں سے سوسائٹی اور معاشرے کے حقوق کے تانے بانے ٹوٹتے چلے جاتے ہیں، پہلے وہ اجتماعی خیر کے اداروں سے ہاتھ روکتا ہے، خیرات اور صدقات کے لیے اس کی مٹھی بھینچ جاتی ہے اور اگر اس کے گرد کوئی حساس معاشرہ موجود نہیں ہے جو اس کی بے راہ روی کو راست روی سے بدل سکے اور کوئی نظام حکومت ایسا نہیں ہے جو اس کے اندر پرورش پانے والے اس زہر کو اس کے اندر سے نکال سکے تو پھر اس کے مال میں سے محتاجوں کا حق سلب ہو جاتا ہے۔ اس کے قریبی رشتہ داروں کے حقوق مارے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے اپنے ہمسائے دوست، آشنا، ماں، باپ اور بیوی بچے تک اس کی ہتھیلی کو اپنے حقوق کے لیے کھول نہیں سکتے۔ ایسی حالت میں کسی معاشرہ کے اندر ایسا انسان ایک زہرناک سانپ ہوتا ہے جو صرف اپنی کنڈلی کے نیچے سب کچھ لے لینا چاہتا ہے اور جو اس سے حق طلبی کرتا ہے اس پر نفرت اور حقارت کی پھنکار مارتا ہے۔ ایسا معاشرہ جس کے کمزور اور پسماندہ افراد کو اس کی ضروریات کے حصول کی کوئی اخلاقی یا قانونی ضمانت نظام باطل کی طرف سے حاصل نہیں ہوتی۔ ایسے سرمایہ دارانہ نظام میں ایک طرف کمزوروں اور مفلسوں، غریبوں اور لاچاروں کے گروہ در گروہ دھکے کھاتے ہوئے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف دولت پرستوں کے ڈھیر بنتے چلے جاتے ہیں جو بنکوں اور کارخانوں میں بیٹھے ہوئے صرف لوگوں کا خون چوسا کرتے اور اس کی نئی نئی تدابیر سوچا کرتے ہیں۔

ایسی شدید خود غرضی، ایسی زہرناک انفرادیت، اور ایسی تلخ انسان کشی اس معاشرے میں پیدا ہوتی ہے جو اخلاقی قدروں پر نہیں، بلکہ زرپرستی کے اصولوں پر تعمیر ہوا ہو۔ خود غرضی، مفاد پرستی، انفرادیت پسندی مادہ پرستی اور لذت پرستی کے سرمایہ دارانہ اصول حقیقت یہ ہے کہ زرپرستی خود ایک علیحدہ نصب العین ہے جسے اپنی زندگی کے لیے قبول کرنے والا ہر شخص صرف اپنی ذات کے فائدے کو ہی زندگی کی دوسری تمام قدروں پر ترجیح دیتا ہے، گویا ایک ایسا شخص جس نے حصول زر کو ہی مقصد زندگی قرار دے رکھا ہو کسی ایسی جدوجہد میں حصہ نہیں لے سکتا جو اس سے اس کے اوقات میں سے وقت مانگے۔ اس کے مال میں

سے مال مانگے، اس کی قوتوں میں سے قوتیں طلب کرے، اور اس کے ذرائع و وسائل میں سے اپنا حصہ وصول کرنا چاہے - زرپرست کو تو بنیادی طور پر صرف کی مد سے نفرت ہوتی ہے اور وہ جب تک زرپرست ہے اس وقت تک صرف کی کسی مد کو بھی وہ خوشی اور مسرت سے برداشت نہیں کر سکتا ۔

ہر تحریک قربانی، جد وجہد صرفِ مال اور اتلافِ جان کا تقاضا کرتی ہے کوئی شخص بیٹھے ہوئے دل، ڈگمگاتے ہوئے قدموں، پریشان اور مذبذب دماغ اور بھینچی ہوئی مٹھیوں کے ساتھ کسی تحریک کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ ایک عاشقِ زر اپنی ذات سے خارج کسی مقصد کے لیے قربانی، جد وجہد، صرفِ مال یا اتلافِ جان کا تصور بھی نہیں کر سکتا اس لیے ایک زرپرست کے لیے ناممکن ہے کہ وہ کسی ایسی تحریک کا ساتھ دے سکے جو اس سے ایسے شدید تقاضے کرتی ہو۔ زیادہ سے زیادہ وہ سودا کر سکتا ہے اور کاروباری ذہنیت کے ساتھ کسی تحریک میں روپیہ (INVEST) لگا سکتا ہے اور وہ بھی نفع کے تمام دیگر امکانات دیکھ کر ہی وہ ایسا کرنے پر آمادہ ہوتا ہے، ممکن ہے کہ ایسے لوگ جو صرف ذاتی مقاصد کے لیے جد وجہد کر رہے ہوں وہ کسی سرمایہ دار سے ایسے سودے پر تیار ہو جائیں کہ "نصف الذی و نصف لکم" لیکن کسی اصولی تحریک کے علمبردار ایسے کھوٹے سکوں اور ایسے نفع کے دوستوں کو اپنی اجتماعیت کے قریب بھی پھٹکنے نہیں دے سکتے اس لیے کہ ابنِ زر تجوری کے سوا کسی کا بھی سگا نہیں ہوتا۔

ہم دنیا کی تحریکوں پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ زرپرستوں نے کبھی کسی تحریک کا ساتھ نہیں دیا اور نہ ہی ان کے کیریکٹر میں کبھی اتنی مضبوطی پیدا ہو سکی ہے کہ وہ کسی بلند نصب العین کے لیے حوادث اور آزمائشوں کی کھکھیڑ برداشت کر سکیں۔ اگر نفسیاتی پہلو سے غور کیا جائے تو کسی ابنِ زر کو کسی اٹھنے والی تحریک کا ساتھ دینا بھی نہیں چاہیے۔ اس کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے کہ حاضر مفاد کو کسی غائب نفع پر ترجیح دے سکے۔ ہر نظام کا اہلِ زر طبقہ اس نظام کا سب سے بڑا حامی اور مؤید ہوتا ہے اس لیے کہ اسے اس نظام کے وجود نے ہی منافعوں اور فائدوں اور مناصب و مرتبوں سے نوازا ہوتا ہے۔ اس لیے وقت کے غالب نظام سے سب سے زیادہ مطمئن یہی گروہ ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں کوئی تحریک اس وقت اٹھتی ہے جب کچھ لوگ کسی نظام کی بے انصافیوں، قہرمانیوں، اور بے عدلیوں سے پریشان ہو کر اسے بدلنا چاہتے ہیں اور اس کا وجود اپنے ضمیر کے خلاف پاتے ہیں۔ یہ گروہ اس نظام سے قطعی غیر مطمئن اور اسے اپنی زندگیوں کے لیے قطعی ضرر رساں سمجھتا ہے۔ اسے اپنے نظریۂ زندگی کے خلاف اور اسے اپنے معتقدات کے

کے مخالف پاتا ہے۔ پھر انہی بنیادوں پر چاہے وہ معاشی ہوں یا اخلاقی اور ایمانی، نسلی اور قومی ہوں یا اصولی اور معتقداتی، ان بنیادوں کے گرد اس نظام کے تحت رہنے والے تمام وہ غیرمطمئن لوگ جمع ہو جاتے ہیں، جو مشترک مقاصد کے ساتھ اس نظام کو اکھاڑ پھینکنے کا مشترک طریقِ کار رکھتے ہوں۔ چنانچہ ہوسکتا ہے کہ ایک نظام کو اکھاڑنے کے لیے بیک وقت کئی گروہ زور لگا رہے ہوں اور ان کے طریق کار مختلف ہونے کے سبب وہ علٰحدہ علٰحدہ پلیٹ فارموں سے کام کر رہے ہوں لیکن مشترک دشمن ہونے کے سبب ان کی ضربوں کا ہدف ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کی تعمیر کے خاکے مختلف ہوں لیکن ان کی تخریب کے کھنڈرات یکساں ہوتے ہیں۔ وہ یکساں وجوہ دل گرفتگی رکھتے ہیں فی الجملہ وہ نظامِ حاضر سے کسی نہ کسی صورت غیرمطمئن ہوتے ہیں۔

لیکن اہلِ زر طبقہ حاضر نظام سے کبھی غیرمطمئن نہیں ہوتا اس لیے کہ اسی نظام کے سائے میں اسی کی تجوریوں کے پیٹ پھولے ہوتے ہیں اور ان کے بنکوں کے حسابات بڑھے ہوتے ہیں، اس طبقہ میں سے شاذونادر ہی کوئی ہوتا ہے جو تہہ دل سے اس نظام کو اکھاڑ پھینکنا چاہے جس کے نیچے اس کے محلوں کے کنگرے اور اس کی کوٹھیوں کے کورٹ یارڈ تعمیر ہوئے ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اہل زر گروہ میں موجود الوقت نظام کے خلاف فطری طور پر ہی بغاوت کرنے کی نہ صلاحیت ہوتی ہے اور نہ اس کی حس ہوتی ہے اور نہ ان میں اس کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔

مارکس آوارگی میں یورپ کی خاک چھانتا رہا۔ اس کے نظریات کو پیٹ بھروں نے بھی پڑھا اور پسند کیا، لیکن وہ پسندیدگی کی حد تک ہی رہا اس نے اپنی زندگی کے تمام روشن دن اس نصب العین کے حصول میں صرف کر دیے جن پر وہ ایمان رکھتا تھا لیکن وہ کوئی محسوس تحریک نہ چلا سکا۔ لینن وکالت کی زندگی چھوڑ کر تحریک کے بھنور میں کودا اور اس نے اس سے دریغ نہیں کیا کہ اسے مہینوں اور برسوں روپوشی کی پرمشقت زندگی میں مصیبتیں جھیلنی پڑیں یا سائبیریا کے برفستانوں کو آباد کرنا پڑا اور نہ ہی اس کے ساتھیوں نے کبھی اپنی جدوجہد کے دوران آرام و آسائش کے خواب دیکھے، لیکن اس کشمکش کے دوران میں روس کا سارا مالدار طبقہ زار کے ساتھ ہی رہا۔ یہی وجہ تھی کہ تحریک کی کامیابی نے اس گروہ کے خلاف اتنے شدید انتقامی جذبے کا اظہار کیا کہ جس کی دردناک اور وحشت ناک تاریخ انقلاباتِ عالم میں نمایاں ہے۔

انقلابِ فرانس میں سارا زور مالدار طبقے کے خلاف تھا اور اہلِ زر کی زیادتیوں کا یہ ردِ عمل ہوا کہ جو سفید اور باوضع لباس میں بھی نظر آیا اسے مالدار کہہ کر گولی مار دی گئی اس تحریک میں بھی اہلِ زر کا قدم انقلاب پسندوں کے ساتھ نہ تھا ۔ انگلینڈ کی ساری تاریخ میں ہاؤس آف لارڈز نے کبھی جمہوری تحریکوں کا ساتھ نہ دیا۔

اسلام بھی اپنے دائرے میں ایسے ہی لوگوں کو لینا پسند کرتا ہے جو تحریک کے عمومی تقاضوں کو پورا کرنے کی اہلیت رکھنے کے ساتھ ساتھ اس تحریک کے خصوصی اور اخلاقی تقاضوں کو بھی سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی ہمت وصلاحیت رکھتے ہوں ۔ کسی تحریک کا ساتھ دینا تھڑدلوں اور منفعل مزاج افراد کا کام نہیں ہوتا اور نہ ان لوگوں کا کام ہوتا ہے جنہوں نے ذاتی مفاد کے بت کو اپنے دل کی سب سے اونچی جگہ پر بٹھا رکھا ہو ۔ ایک تحریک کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کی صفوں میں ایسے لوگوں کا گذر ہو جو قربانی وجاں سپاری کی صفات سے عاری ہوں اور فاطرِ کائنات انسانی فطرتوں کا خالق خوب جانتا ہے کہ کونسی چیز ہے جو انسان کے قدموں کو بوجھل ، اس کے ارادوں کو متزلزل ، اس کے حوصلوں کو بے وقار اور اس کی پرواز کو کوتاہ کر دیتی ہے ۔ چنانچہ قرآن نے وہ زہر کھول کھول کر بیان کر دیئے ہیں جو کسی اسلامی تحریک کے افراد کو بے جان و بے کار کر دینے والے ہوتے ہیں اور عام مسلمانوں کو آگاہ کر دیا ہے کہ حُبِّ زر اور حبِّ اللہ میں کوئی قدرِ مشترک تلاش نہیں کی جا سکتی ۔

چنانچہ دنیا کے سب سے بڑے اخلاقی انقلاب کی اسلامی تحریک پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو اس تحریک کے افراد میں بھی ہمیں اہل زر طبقے کے افراد خال خال ہی نظر آتے ہیں اور جو دکھائی دیتے ہیں ان کے نزدیک روپیہ کوئی قابلِ عزت چیز نہیں ہے بلکہ وہ اسے یوں لٹاتے ہیں جیسے صحن سے مٹی کے ڈھیر اٹھوا دیئے جاتے ہیں اس تحریک کے داعیوں میں سے کسی کے دل میں بھی زر کی اہمیت پرِ کاہ کے برابر نظر نہیں آتی وہاں جو کچھ قیمتی ہے وہ صرف خدا خوفی اور خشیت الٰہی ہے ۔ دیانت، تقوٰی اور پرہیزگاری ہے ۔ حبِّ اللہ اور اطاعتِ رسول ہے ۔ اس سے بڑی قیمتی چیز اس انقلابی سوسائٹی میں اور کوئی نظر نہیں آتی ۔ وہ روپے کے عوض انسانی ضمیر اخلاق اور تقوٰی بیچتے ہوئے نظر نہیں آتے ۔ وہاں روپے کی قیمت دین و ایمان نہیں ہے بلکہ وہ مادی استعمالی چیزوں میں سے ایک چیز ہے اور وہ کچھ ایسی اہم بھی نہیں ہے کہ وہ جدھر ہو اسی کا وزن زیادہ ہو جائے اس تحریک کے داعی حاکمیتِ الٰہی کے اعلان کے مقابلے میں بڑی سے

بڑی پیشکش کو ٹھکرا دیتے ہیں اور دولت کے انباروں اور بادشاہت کے لالچوں کے مقابلے میں صاف صاف اعلان کر دیتے ہیں کہ:

"خدا کی قسم اگر تم میرے ایک ہاتھ میں سورج اور ایک ہاتھ میں چاند بھی لاکر رکھ دو تو میں اس دعوت سے باز نہ آؤں گا"

چنانچہ ایسے گروہ کی فراہمی کے لیے جو بنیادی ہدایات دی جا رہی ہیں وہ صاف صاف بتلاتی ہیں کہ زر کو زندگی کا مقصود بنانے والوں کے لیے اس تحریک میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ چنانچہ بار بار اسی رگ پر ضرب لگائی گئی ہے جو انسان کو نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے ہر بلند مقصد سے پہلو تہی کرنے پر مجبور کرتی رہتی ہے۔

"تم نیکی کے مقام کو نہیں پا سکتے جب تک کہ وہ چیزیں خدا کی راہ میں قربان نہ کرو جن سے تم کو محبت ہے۔" (قرآن)

"جو لوگ دل کی تنگی سے بچ گئے وہی فلاح پانے والے ہیں" (قرآن)

"اے ایمان والو مال و اولاد کی محبت تم کو خدا کی یاد سے غافل نہ کر دے جو ایسا کرے گا وہ خود ٹوٹے میں رہنے والا ہے" (قرآن)

اسی طرح تحریک کی رہنمائی کی جا رہی ہے اور چن چن کر ان جراثیم کی نشان دہی کی جا رہی ہے جو کردار کو کھوکھلا، تحریک کو کمزور اور اس کی منزل کو دھندلکوں میں محو کر دینے والے ہیں۔

"شیطان تم کو ڈراتا ہے کہ تم خرچ کرو گے تو فقیر ہو جاؤ گے وہ تمہیں شرمناک چیز یعنی بخیلی کی تعلیم دیتا ہے" (قرآن)

"اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھ سے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو کہ راہِ خدا میں خرچ نہ کرنے کے معنی ہلاکت اور بربادی کے ہیں" (قرآن)

"ہر اس طعن باز نکتہ چین پر تباہی ہے جس نے دولت سمیٹی اور اسے گن گن کر رکھا اور سمجھتا ہے کہ اس کی دولت ہمیشہ اس کا ساتھ دے گی۔" (قرآن)

یہاں اس سرمایہ دارانہ ذہنیت کی پوری پوری نشاندہی کر دی گئی ہے جو تحریکوں کے لیے زہر قاتل ہے

"اور جو لوگ سونے چاندی کے خزانے جمع کر رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں صرف

نہیں کرتے۔ ان کو عذابِ الیم کی خوشخبری سنا دیجئے (قرآن)

اور وہ خوشخبری یہ ہے۔

"سونے چاندی کی ٹکیوں کو تپا تپا کر ان سے ان کی پیشانیوں کو داغا جائے گا" (قرآن)

تحریک کی ضرورتوں کو جانتے ہوئے بھی بخل کرنے والوں کے متعلق فرمایا

"کنجوسوں کے متعلق یہ نہ سمجھو کہ اللہ نے ان کو جو مال شے رکھا ہے وہ ان کے لیے مفید ہے نہیں وہ ان کے لیے مضر ہے۔ قیامت کے دن اُن کی کنجوسی کا سارا حاصل طوق بنا کر ان کی گردنوں میں لٹکایا جائے گا"۔ (قرآن)

جو زر کو تحریک کے مقاصد سے عزیز رکھتے ہیں، ان سے کہا گیا۔

"سُن رکھو تم لوگ ایسے ہو کہ تم کو راہ خدا میں خرچ کرنے کے لیے کہا جاتا ہے تو تم میں سے بہت سے لوگ بخل کرتے ہیں اور جو کوئی اس کام سے بخل کرتا ہے وہ خود اپنے ہی لیے بخل کرتا ہے اللہ تو غنی ہے تم ہی اس کے محتاج ہو۔ اگر تم نے خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے منہ موڑا تو وہ تمہاری جگہ دوسری قوم کو لے آئے گا جو تم جیسے نہ ہوں گے" (قرآن)

قرآن کی تصریحات کے ساتھ تحریک کے داعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صاف صاف صراحت فرما دی۔

"وہ لوگ خسارے میں ہیں خدا کی قسم وہ لوگ خسارے میں ہیں جو یوں اور یوں (دائیں بائیں) خرچ نہیں کرتے" (حدیث)

تحریک کے لیڈروں نے اہلِ زر کی سی خصوصیات اور ان کے سے رجحانات پیدا ہونے سے تحریک کے افراد کو سختی سے روکا۔ عاملینِ حکومت کو ہدایات دیتے ہوئے حضرت عمرؓ نے ان رجحانات کی پوری پوری نشاندہی کی اور ان سے پورے طور پر رد کنے کی کوشش کی فرمایا کہ:

عہد کرو کہ:

۱۔ تم ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہو گے۔

۲۔ باریک امیرانہ لباس نہ پہنو گے۔

۳۔ میدے کی روٹی نہ کھاؤ گے۔

۴۔ دروازے پر دربان نہ رکھو گے اور اہل حاجت کے لیے دروازہ ہمیشہ کھلا رکھو گے۔ چنانچہ جب گورنر مصر عیاض بن غنم کے متعلق ایسی شکایت سُنی تو انہیں پکڑ بلوایا اور ان کو کھردرا لباس پہنا کر بکریاں چرانے کا حکم دیا۔

حضرت سعدؓ بن وقاص نے عالیشان مکان کی ڈیوڑھی بنائی تو آدمی بھیج کر اسے آگ لگوا دی۔

اور اسی طرح اہلِ زر کی سی خصوصیات پیدا ہونے سے تحریک کے افراد کی سختی سے نگرانی کی اس لیے کہ ان صفات کے پیدا ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ انسان حق سے مداہنت برتے اور ذاتی مفاد کا دلوانہ ہو کر رہ جائے۔

اسلام نے اپنے قانون کے ذریعے بھی اہلِ زر کی سی قباحتیں اور ان کا ایک طبقہ پیدا ہونے سے اپنے معاشرے کو بچانے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس نے قانونِ وراثت سے دولت کے دائمی سمٹاؤ کو شدت سے روکا ہے۔ اس نے زکوٰۃ، صدقہ، خیرات، حقوقِ اقربا، حقوقِ والدین، ہمسائے، اہل محلہ اور پوری سوسائٹی کے حقوق مقرر کر کے دولت والوں کے خزانوں کی بے شمار نالیاں نکال دی ہیں اور اس نے دولت جمع ہونے کے سب ناجائز راستے بند کر دیے ہیں۔ اس نے اہلِ محنت کے حقوق متعین کر کے اس سرمایہ دارانہ ذہنیت کا قلع قمع کر دیا ہے جو مزدور کی ساری طاقت چوس کر بھی اسے باعزت روٹی دینے پر آمادہ نہیں ہوتی اور اس طرح تحریک کو اہلِ زر کی سی خصوصیات کے مفاسد سے پوری قوت سے بچایا ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر اس تحریک میں خال خال کوئی اہلِ زر کہلا سکتا ہے تو وہ زرپرستی کی خصوصیت سے پوری طرح پاک ہے۔ موقع پیش آتا ہے تو وہ پوری پوری فوج کے لیے اُونٹ اور گھوڑے اور سامانِ رسد فراہم کر دیتا ہے۔ موقع آتا ہے تو وہ اسلام کے لیے اپنا سارا اثاثہ لا کر راہ میں ڈال دیتا ہے۔ موقع آتا ہے تو وہ حبش کی طرف ہجرت کرتا ہے۔ موقع آتا ہے تو وہ سب کچھ لٹا کر مطمئن ہوتا ہے کہ اس نے سب کچھ پا لیا ہے۔ وہ دولت کا پجاری نہیں صرف اللہ کا بندہ نظر آتا ہے۔

اسلام بنیادی طور پر زر کو کوئی اہمیت نہیں دیتا وہاں صرف جذبے، اخلاص اور عمل کو اہمیت حاصل ہے جس وقت تحریک کے کارکن خدا کی راہ میں اپنے مال و زر کو ڈھیر کر دیتے ہیں تو تحریک کا داعی ایک مخلص کارکن کی مزدوری کے دو سیر چھوہارے لے کر اس سارے انبارِ اسباب پر یہ کہتے ہوئے چھڑکتا ہے کہ "یہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے ان سب پر حاوی ہیں" اس لیے کہ اس نے اپنی عام امداد کے ساتھ ان چھوہاروں کے لیے خاص طور

پر اپنے آرام کے اوقات کو قربان کر کے رات بھر مزدوری کی ہوتی ہے۔ اور اس مشقت کے عوض میں جو اسے ملا ہوتا ہے وہ لاکر خدا کی راہ میں ڈال دیتا ہے اس لیے یہ اثاثہ جو خلوص و محبت اور حسن نیت کا بہترین نمونہ ہے۔ ان سارے سامانوں پر اپنی معنویت کے لحاظ سے فضیلت رکھتا ہے۔

آج بھی اسلام کی سربلندی کی جدوجہد میں ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے اور ایسے ہی لوگ دنیا میں کچھ کر سکتے ہیں جو آرام، مفاد، زر اور نظام موجود سے وابستہ تمام توقعات سے اپنی پہلی فرصت میں دست بردار ہوں۔ اپنے حال سے ساری امیدیں اٹھا رکھیں۔ اپنے اسباب راہ حق میں لٹانے کے لیے باندھ رکھیں اور اپنے سینے چھلنی کروانے کے لیے مشیتِ الٰہی سے ثابت قدمی کی توفیق مانگ رکھیں جو بھوک اور پیاس اور بےبسی اور بےچارگی کی رفاقت کا مزہ چکھنے کا عزم کر رکھیں اور جو اپنی شدید سے شدید محنتوں سے کم سے کم معاوضوں کو بھی خدا کی راہ میں دینے کے بعد مزید محنتوں کے سرمائے اس راہ میں لٹانے پر اپنے دلوں میں آمادگی پیدا کر سکیں۔ ایسے ہی لوگ ہوں گے جو ایک نظام کو الٹ کر ایک دوسرے نظام کی بنیاد ڈالیں گے اور ایسے ہی لوگ ہوں گے جو دنیا بھر کی کھکھیڑ سہہ کر بھی امیدوں کے تمام سہارے ایک حق سے ہی وابستہ رکھ سکیں گے۔

جن لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہو کہ وہ مسلط نظام کے ساتھ اپنی مصالحتیں اور عہد و پیمان بھی نبھائیں اور اس کی دل نواز ہواؤں میں اپنی کشتیوں کے بادبانوں کو بھی اڑائیں۔ ان کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے دلوں کو انقلابی تصورات کے خلجان میں ڈالیں، ان کے لیے یہی موزوں ہے کہ اپنے مفاد کی پرستش کرتے ہوئے مُصلیانہ شکل و صورت بنائے رکھیں اور جب آنے والا انقلاب آجائے تو وہ بھی اپنا دامن امید اٹھائے ہوئے آشامل ہوں اور آکر کہیں کہ ہم بھی نظام اسلامی کے عشق میں مبتلا تھے اور آپ کی سرگرمیوں سے دل ہی دل میں پورا پورا اتفاق رکھتے تھے۔

مطبوعات

برصغیر پاک و ہند میں علمِ فقہ

تالیف: مولانا محمد اسحٰق بھٹی ۔ ناشر: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور

کتابت، طباعت گوارا ۔ سفید کاغذ کے ۴۸۳ صفحات ۔ قیمت مجلد: ۱۱/۰۰ روپے

زیرِ نظر کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے برصغیر پاک و ہند میں فقہِ اسلامی کے آغاز اور اس کی ترویج و اشاعت سے متعلق ہے ۔ اُردو لٹریچر میں غالباً یہ اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف ہے جس میں غیاث الدین بلبن (۶۸۶ھ) کے عہد سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر (۱۱۱۸ھ) کے زمانہ تک کی تمام فقہی تالیفات کا ذکر کیا گیا ہے ۔

ابتدا میں فاضل مؤلف نے ایک مقدمہ سپرد قلم کیا ہے جس میں علمِ فقہ کی تعریف، اس کی ضرورت و اہمیت، اس کے مآخذ اور فقہائے صحابہ و تابعین کا ذکر کیا ہے نیز صدرِ اول میں مختلف دیار و امصار میں اہلِ علم کی فقہی سرگرمیاں بالخصوص آئمہ اربعہ کے اصول و نہجِ استدلال اور استنباطِ مسائل کے ذرائع پر روشنی ڈالی ہے ۔ علاوہ ازیں برصغیر میں اسلام کی آمد و اشاعت کا بھی تاریخی و فقہی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے پورا مقدمہ وقیع معلومات اور ٹھوس علمی مواد سے مملو ہے ۔

اس کے بعد محترم مؤلف نے جن فقہی کتب سے قارئین کو متعارف کرایا ہے وہ اصلاً مجموعہائے فتاوٰی ہیں جو ابھی تک مخطوطات اور غیر مطبوعہ قلمی مسوّدات کی صورت میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہیں ۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

فتاوٰی غیاثیہ[1]، فتاوٰی قراخانی[2]، فوائد فیروز شاہی[3]، فتاوٰی تاتارخانیہ[4]، فتاوٰی حمّادیہ[5]، فتاوٰی ابراہیم شاہی فارسی و عربی[6]، فتاوٰی امینیہ[7]، المتانۃ فی مرمۃ الخزانۃ[8]، فتاوٰی بابری[9]، فتاوٰی عالمگیری[10] ——— ان مجموعہ ہائے احکام الفقہ کے مندرجات پر روشنی ڈالنے سے پہلے فاضل مؤلف نے ان میں سے ہر ایک کے زمانۂ تالیف کا مختصر تاریخی جائزہ لیا ہے وقت کے حکمران کے بارے میں کچھ مفید معلومات دی ہیں ۔ مخطوطے کی کیفیت، فہرست مضامین، اس کے مآخذ و مخففات اور اس میں مذکورہ بعض اہم مسائل کا ذکر کیا ہے اور آخر میں بعض کتبِ فقہ کا ضروری حد تک تعارف کرایا گیا ہے ۔

بلاشبہ کتاب زیرِ تبصرہ کی تدوین و تالیف میں فاضل مؤلف نے بہت جانفشانی سے کام لیا ہے اور نئی نسل کو ماضی قریب کے فقہی سرمائے سے روشناس کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے ۔

اصحابِؓ بدر

مؤلف :۔ قاضی محمد سلیمان منصور پوری ۔ ناشر :۔ مکتبہ نذیریہ نزد جامع نذیریہ فیروز پور روڈ ۔ لاہور

کتابت طباعت عمدہ ، سفید کاغذ ، بڑے سائز کے ۱۴۴ صفحات ۔ قیمت مجلد :۔ ۹/۰۰ روپے

رحمۃ اللعالمین کے مؤلف محترم قاضی محمد سلیمان منصور پوری کا اسمِ گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ موصوف ماضی قریب کے ایک صاحبِ تحقیق مورخ ہیں اور ان کا یہ اندازِ تحریر ان کی ہر تالیف میں پایا جاتا ہے ۔ زیرِ نظر کتابچہ میں مرحوم نے ان صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مختصر حالات بیان کیے ہیں جنہیں غزوۂ بدر میں شمولیت کی سعادت نصیب ہوئی ۔ بعض انصار و مہاجرین کے حالات تو قدرے تفصیل سے قلمبند کیے گئے ہیں مگر بیشتر بدریین کا تعارف ایک دو سطروں میں ہی کرایا گیا ہے ۔ تاہم اس میں کچھ شبہ نہیں کہ جو کچھ لکھا گیا ہے تحقیق سے لکھا گیا ہے ۔ شروع میں ستّرہ صفحات پر مشتمل ایک مقدمہ بعنوان "غزوۂ بدر" سپردِ قلم کیا گیا ہے جس میں غزوۂ بدر کے تقریباً سارے ہی قابلِ ذکر پہلو اختصار کے ساتھ پیش کر دیے گئے ہیں ۔

مشہور روایت کی رو سے شرکائے غزوۂ بدر کی تعداد تین سو تیرہ (۳۱۳) ہے اور دوسری روایات کو بھی نگاہ میں رکھا جائے تو اس میں چار چھ حضرات کا اور اضافہ ہو جاتا ہے لیکن قاضی صاحب نے زیرِ تبصرہ کتاب میں مہاجرین کے ضمن میں ستّاسی (۸۷) اصحابِؓ رسولؐ کا ذکر کیا ہے اور الانصار کے ذیل میں دو سو اڑتالیس (۲۴۸) صحابہ کرامؓ کے نام گنائے ہیں ۔ اس حساب سے بدریین کی کل تعداد تین سو پینتیس بنتی ہے جو تبصرہ نگار کے علم کے مطابق درست نہیں اور نہ خود فاضل مؤلف کی تحقیق کے مطابق صحیح ہے (ص۱۰) مولانا محمد حنیف صاحب جن کی تصحیح و نظرِ ثانی کے ساتھ کتاب منصۂ شہود پر آئی ہے ۔ انہوں نے بھی اس الجھن کو صاف نہیں کیا ۔ علاوہ ازیں محترم ناشر کی خدمت میں ہم یہ عرض کرنا بھی مناسب خیال کرتے ہیں کہ فاضل مؤلف کے نام کے ساتھ "پنشنر جج ریاست پٹیالہ" لکھنا ضروری نہیں اور نہ موصوف کے لیے یہ کوئی اعزاز ہے ۔ ان کا سب سے بڑا اعزاز "رحمۃ اللعالمین" کی تالیف ہے ۔

بایں ہمہ اصحابِ بدر کی اشاعت ایک قابلِ قدر کوشش ہے کہ اس کے ذریعے عام پڑھے لکھے لوگ شرکائے بدر کی پاکیزہ اور بابرکت ہستیوں سے کسی حد تک متعارف ہو جائیں گے ۔

سفرنامہ حجاز و حج بیت اللہ

تالیف : عفت الٰہی علوی صاحبہ ۔

ملنے کا پتہ : سی /۳۱ محمد علی سوسائٹی کراچی ۔

قیمت : پانچ روپے ۔ صفحات : ۲۵۲

حج چونکہ دین کا ایک اہم رُکن ہے اس لیے ماضی اور حال دونوں میں اس پر متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں

اور ہر شخص نے اپنی قلبی کیفیت اور اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر اس مقدس سفر اور عبادت کے مختلف حصوں کو بیان کیا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب ایک دردمند خاتون کی حج ڈائری ہے جسے انھوں نے بڑی محنت اور دیدہ وری کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ یوں تو یہ کتاب ایک قابلِ اعتماد رہنمائے حج کا کام دے سکتی ہے مگر خواتین کے لیے اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے کیونکہ مصنفہ نے اُن کی ضروریات اور دشواریوں اور ذمہ داریوں کو خاص طور پر بیان کیا ہے۔

طباعت اور کتابت گوارا ہے۔

روشنی کے مینار تالیف: حافظ محمد ادریس صاحب۔ ایم۔اے۔

شائع کردہ: مکتبۂ ظفر ناشر قرآنی قطعات، گجرات۔

صفحات ۲۰۶ قیمت -/۹ روپے

کسی دین، مذہب یا نظامِ حیات کی عظمت کو پرکھنے کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ فکر و عمل کے اُس انقلاب کا جائزہ لیا جائے جو انسان کے اندر کسی خاص دین یا مذہب کو اپنانے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اسلام نے خدا خوفی اور فکرِ آخرت، ایثار اور قربانی، نیکی اور پرہیزگاری، شرافت اور توکل، زہد و قناعت کے ایسے نادر نمونے پیدا کیے ہیں جن کی نظیر کسی دوسری قوم میں نہیں ملتی اور پھر کمال یہ ہے کہ یہ نمونے تعداد میں اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اسلام کی بہار آتے ہی انسانیت کا چمنستان کھِل اٹھا اور ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں رنگ برنگ پھول مہکنے لگے۔ یہ پھول اگرچہ نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں مگر ان کی مہک سے آج بھی دل و دماغ معطر ہوتے ہیں۔ حافظ محمد ادریس صاحب نے ان مقدس نفوس کو روشنی کے میناروں سے تشبیہ دیتے ہوئے ان کی پاکیزہ زندگیوں کے عکس پیش کیے ہیں۔ اسلام کا انسانیت پر دوسرے احسانات کے علاوہ یہ بھی احسان ہے کہ اس نے اپنی تعلیمات کے ایسے حسین پیکر تیار کیے جن میں وہ تعلیمات پوری طرح جلوہ گر نظر آتی ہیں اور ایک انسان ان پاکیزہ ہستیوں کے ذریعے تعلیماتِ اسلامی کے عملی مظاہر اور مضمرات کو بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ اسلام کو دنیا میں ایک غالب قوت

بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسلامی سیرت و کردار کے یہ نادر نمونے ہر وقت ہمارے سامنے رہیں کیونکہ ان کی پیروی کے بغیر ہم وہ افراد پیدا نہیں کرسکتے جن کے ہاتھوں صحیح اسلامی معاشرہ تشکیل پاسکتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف بیس جانثاروں کے حالات نہایت مختصر طور پر درج ہیں۔ ہم فاضل مصنف کی خدمت میں ایک تو یہ گزارش کریں گے کہ وہ باقی اصحابِ رسول کے حالات بھی قلمبند کریں اور دوسرے حالات کو قدرے جامعیت سے بیان کریں تاکہ پڑھنے والے کو تشنگی محسوس نہ ہو۔

کتابت اور طباعت کا معیار گوارا ہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد شہید	مرتبہ، عمر فاروق احسن صاحب
شعراء کی نظر میں	شائع کردہ۔ اسلامی جمعیت طلبہ

بلاک نمبر ۲ قائداعظم روڈ، نزد ٹاؤن ہال۔ ڈیرہ غازی خان۔

قیمت : ۲ روپے پچاس پیسے - صفحات: ۷۲

ڈاکٹر نذیر احمد کی شہادت پر اس ملک کے ہر ہوشمند اور حساس شخص نے سخت رنج محسوس کیا چنانچہ ہر طبقۂ خیال نے اپنے احساسات کو کسی نہ کسی طرح بیان کرنے کی کوشش کی۔ شعرائے کرام نے اس المیہ پر جس طرح اپنے جذبات کا اظہار کیا اُسے نوجوان مرتب نے زیر تبصرہ کتاب میں یکجا کر دیا ہے۔ یہ ایک قابلِ ستائش کوشش ہے لیکن ہم تحریک اسلامی کے نوجوانوں سے جنھیں ہم دنیائے اسلام کے مستقبل کی روشن اُمیدیں سمجھتے ہیں، یہ ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ وہ تصویر کے معاملے میں بھی اسلام کا نقطۂ نظر ضرور سامنے رکھیں۔ ایک ناگزیر ضرورت کے طور پر تو اس کا جواز نکل سکتا ہے لیکن جس انداز سے انہوں نے ڈاکٹر نذیر احمد شہید کی تصویروں سے اپنی کتاب کو مزین کیا ہے، اُسے خدا کا یہ اطاعت گزار بندہ کبھی پسند نہ کرتا۔

(بقیہ اشارات صفحہ ۳) اور اس سراپا رحمت کی وساطت اور اس کی ہدایت اور رہنمائی میں دُنیوی فلاح اور اُخروی کامرانی کے لیے جدوجہد کرنی چاہیئے۔ کیا یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی رحمت کا اعجاز نہیں کہ اس نے خدا کے بندوں کو عقیدت و محبت کا ایک مستقل محور عطا کر کے انہیں انتشار سے بچایا ہے۔ حضورؐ کے بعد نبوت کے اجراء کا مطلب یہ ہے کہ اُمت مستقل طور پر افتراق اور انتشار کا شکار رہے کیونکہ ایک نبی کے بعد جب بھی دوسرا نبی مبعوث ہوتا ہے تو فطری طور پر کفر و اسلام کا سوال از سرِ نو پیدا ہو جاتا ہے اور اس طرح معاشرہ زیروزبر ہوتا رہتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت سے پہلے چونکہ مختلف انبیاء مختلف قوموں، ملکوں اور نسلوں کی طرف مبعوث ہوتے تھے اس لیے نئے نبی کی تشریف آوری سے پوری نوع انسانی متاثر نہ ہوتی تھی اور کفر و اسلام کا سوال ایک محدود سے حلقے یا دائرے تک مقید رہتا تھا لیکن حضورؐ چونکہ قیامت تک پوری نوع بشری کے لیے خدا کے آخری رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں اور دنیا کے مختلف گوشے بھی سمٹ کر ایک دوسرے کے اس قدر قریب آ گئے ہیں کہ اب کفر اور اسلام کے سوال کو کسی ایک خاص خطے یا کسی ایک قوم یا ملک تک محدود نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ سوال جب بھی پیدا ہو گا تو پوری نوع انسانی اس کی زد میں آ جائے گی۔

جو لوگ اسلام کی ابجد سے بھی کوئی واقفیت رکھتے ہیں وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ سوال سب سے زیادہ قوت اور شدت کے ساتھ اگر دین کے کسی مسئلے پر ابھر سکتا ہے تو وہ صرف نبوت کا مسئلہ ہی ہوتا ہے اور یہ بالکل فطری امر ہے کیونکہ نبی ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس کی رہنمائی میں کوئی شخص خدا کی ذات اور صفات کو پہچانتا اور دوسرے اُمورِ غیب پر ایمان لاتا ہے۔ پھر نبی کی لائی ہوئی تعلیمات کے مطابق وہ نہ صرف حق کو باطل سے ممیز کرتا ہے بلکہ حق کو سربلند کرنے اور باطل کو مٹانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے۔ نبی کی محبت اور عقیدت اس کی زندگی کی سب سے قیمتی متاع ہوتی ہے اور اس کی غلامی اختیار کر کے ہی وہ دنیا اور آخرت میں فائز المرام ہو سکتا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ جس ذات کی دین کے اندر اس قدر غیر معمولی اہمیت ہو کہ اس کی دُنیوی کامرانی اور اُخروی فلاح کا پورا دارو مدار اس ذات کے اتباع پر ہو اور اسے نظر انداز کرنے سے وہ خدا کے غضب کا مستوجب قرار پاتا ہو، اس ذات پر ایمان اور اس کا انکار کسی فرد اور معاشرے کے لیے کوئی معمولی بات تو نہیں ہو سکتی۔

یہی وجہ ہے کہ جب بھی کوئی شخص نبوت کا دعویدار بن کر سامنے آتا ہے تو اسی لمحہ کفر و اسلام کی بحث پوری قوت کے ساتھ چھڑ جاتی ہے۔ جو لوگ اس کے اس دعوئ نبوت کی تصدیق کر کے اس پر ایمان لے آتے ہیں وہ اُن لوگوں سے یکسر کٹ کر ایک الگ اُمت بن جاتے ہیں جو اس کے اس دعوے کو باطل سمجھ کر جھٹلا دیتے ہیں۔ اس طرح پورا معاشرہ دو مختلف گروہوں یا دو مختلف اُمتوں میں بٹ جاتا ہے جن کے افراد کے مابین بعض ظاہری اعمال میں مماثلت کے باوجود سخت افتراق پایا جاتا ہے۔ جب محبت اور عقیدت کے مراکز اور ہدایت کے سرچشمے ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو ان دونوں گروہوں کی معاشرتی اور دینی زندگی کا ایک دوسرے سے الگ ہو جانا بالکل فطری امر ہے۔

سادہ لوح عوام کو دھوکہ دینے کے لیے مرزا غلام احمد قادیانی کے پیرو جو چاہے کہتے رہیں لیکن اس حقیقت سے آخر کس قدر انکار کیا جا سکتا ہے کہ جو لوگ بھی مرزا صاحب پر ایمان نہیں رکھتے انہیں مرزا صاحب اور اُن کے متبعین نے ہمیشہ کافر گردانا ہے اور ان کے ساتھ دینی اور معاشرتی سطح پر اس طرح کا معاملہ کیا ہے جس طرح ایک مسلمان کسی کافر کے ساتھ کرتا ہے۔ چوہدری ظفر اللہ کو پاکستان کی قومی اسمبلی کے فیصلے پر آج یہ بات اچانک یاد آئی ہے کہ ایمان خدا اور انسان کے درمیان ذاتی تعلق ہے لیکن وہ غالباً برہمی کے عالم میں اپنے پیغمبر اور اس کے جانشینوں اور اپنی اُمت کے دوسرے اکابرین کے نقطہ نظر اور طرزِ عمل کو بھول گئے ہیں جو مرزا صاحب اور اُن کی جماعت نے دوسرے مسلمانوں سے زندگی کے مختلف دائروں میں روا رکھا ہے۔ مرزا صاحب نے اپنے دعوائے نبوت کے جھٹلانے والوں کو نہ صرف کافر قرار دیا ہے بلکہ انہیں اس قدر گھٹیا الفاظ سے یاد کیا ہے کہ بار بار تہذیب کی نگاہیں نیچی اور حیا کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ اُن کے لیے انہوں نے ذُرّیۃ البغایا (بدکار عورتوں کی اولاد)، لعین، نطفۃ السفہا، کلاب، شیطان اعمی، غول اغوی اور ملعون کے الفاظ اس کثرت سے استعمال کیے ہیں کہ گویا یہ "جواہر پارے" مرزا صاحب کا تکیہ کلام ہیں۔

یہ تو ہے مسلمانوں کے بارے میں مرزا صاحب کی دلی کیفیت کا عکس۔ جہاں تک مذہبی بُعد کا تعلق ہے اُس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مرزا صاحب اور ان کے ماننے والوں کے نزدیک کسی غیر قادیانی امام کے پیچھے نماز پڑھنا یا کسی غیر قادیانی کا جنازہ پڑھنا، خواہ وہ بچہ ہی کیوں نہ ہو قطعاً حرام ہے۔

راقم الحروف کو سر ظفر اللہ کی خود نوشت سوانح حیات "تحدیث نعمت" کا انہی دنوں پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس کے مطالعہ سے ایک بات بالکل واضح معلوم ہوتی ہے کہ یہ صاحب مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے خلفاء اور انگریزی استعمار اور مغرب کی دوسری اسلام دشمن طاقتوں کے مابین ہمیشہ ایک قابل اعتماد رابطہ افسر کا فرض سرانجام دیتے رہے ہیں اور انہیں مرزا صاحب اور ان کے جانشینوں خصوصاً حکیم نورالدین کا بہت زیادہ قرب حاصل رہا ہے۔ میں انہیں اس ایمان کا واسطہ دے کر جسے وہ خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق سمجھتے ہیں، یہ پوچھتا ہوں کہ کیا انہیں ان مظلوموں پر کبھی ترس نہیں آیا جنہیں خلافت سے معمولی اختلاف کی وجہ سے یا تو قتل کر دیا گیا یا شدید ظلم وستم کا تختہ مشق بنایا گیا۔ اگر ایمان قلبی کیفیت کا ہی نام ہے تو پھر اس اختلاف کی بنا پر اس جبر وتشدد کا آخر کیا جواز ہو سکتا ہے۔ آپ غالباً اس دل ہلا دینے والے معاشرتی مقاطعہ سے بھی واقف ہوں گے جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ایک آپ کی جماعت کے ایک فرد نے سخت مجبوری کی بنا پر اپنی ایک لڑکی کسی غیر احمدی کے نکاح میں دے دی اور اس کے اس جرم کی پاداش میں آپ کے محسن اور مربی حکیم نورالدین نے نہ صرف اس بیچارے کو احمدیوں کی امامت سے ہٹا دیا اور جماعت سے خارج کر دیا بلکہ اپنی خلافت کے چھ سالوں میں اس کی توبہ قبول نہ کی باوجودیکہ وہ بار بار توبہ کرتا رہا۔ آپ کو اگر اس واقعہ کا علم نہ ہو تو آپ اسے انوار خلافت میں دیکھ سکتے ہیں۔ اگر ایمان محض قلبی کیفیت کا نام ہے اور اس بنا پر اسے کسی معاشرتی طرز عمل میں منعکس نہ ہونا چاہیئے تو پھر اپنی جماعت کے سربراہوں کی ان سفاکیوں اور زیردست آزاریوں پر خون کے آنسو بہایئے جن کی وجہ سے نہ صرف عامۃ المسلمین بلکہ آپ کی جماعت کے بعض سرکردہ افراد کو اپنی زندگیوں تک سے ہاتھ دھونے پڑے۔

ضروری اعلان

تفہیم القرآن

کے نئے ایڈیشن

طبع ہو کر آ گئے ہیں۔ قارئین کرام و ایجنٹ حضرات آج ہی اپنے آرڈر سے

مطلع فرمائیں

ہدیہ تفہیم القرآن	جلد سوم	————	۴۴/- روپے
" "	جلد چہارم	————	۳۷/- "
" "	جلد ششم	————	۳۸/- "

ادارہ ترجمان القرآن۔ اچھرہ۔ لاہور